ذکرِ رسولؐ

66

کوثر نیازی

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز
لاھور۔ حیدرآباد ۔ کراچی

طابع: شیخ نیاز احمد

مطبع: غلام علی پبلشرز، لاہور

اشاعت اول: مارچ ۱۹۷۶ء

تعداد: دس ہزار

قیمت: پندرہ روپے

مقام اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

اُدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

مندرجات

گذارش

"ذکرِ رسولؐ" ہدیۂ قارئین ہے۔ پچھلے سال یہ کتاب "میلادالنبیؐ اور اُس کے تقاضے" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہُوئی۔

طبعِ ثانی کے موقع پر خیال آیا کہ اس میں حضور پاکؐ کی سیرت کے متعلق میری وُہ تحریریں بھی شامل کر دی جائیں جو مختلف جگہوں میں بکھری ہُوئی ہیں۔

چونکہ اس کتاب میں کئی نگارشات میلادالنبیؐ سے متعلق بھی ہیں اس لیے آغاز میں میلادالنبیؐ کی شرعی حیثیت پر ایک ذیلی باب بڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے کے مقابلہ میں اب یہ ایک زیادہ جامع تالیف ہو گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میلاد کی محفلوں اور سیرت پاک کے جلسوں میں اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

کوثر نیازی

نازاں ہے جس پہ حُسن وُہ حُسنِ رسُولؐ ہے
یہ کہکشاں تو آپؐ کے قدموں کی دُھول ہے

ابتدائیہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات والاصفات وجہِ تکوینِ کائنات اور سرچشمۂ برکات ہے۔ اِس دُنیائے آب و گل میں آنحضورؐ کی آمد کا دن سعادتوں اور رحمتوں کے نزول کا اور آنحضورؐ کی اُمّت کے لیے خوشیوں اور مسرّتوں کے آغاز کا دن ہے۔ اس یومِ مبارک پر ہم جتنی بھی خوشیاں منائیں بجا اور جتنی بھی مسرتوں کا اظہار کریں زیبا ہے۔ چنانچہ دُنیا بھر کے مسلمان اس یومِ سعید پر مسرّت و ابتہاج کا اظہار کرتے ہیں۔

مسرّت اور ابتہاج کے کئی انداز اور کئی اسلوب ہیں۔ میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جلسے کیے جاتے ہیں جن میں آنحضورؐ کی سیرتِ مبارکہ پر تقاریر کی جاتی ہیں۔ نعت خوانی کی محفلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، قرآن خوانی اور صلوٰۃ وسلام کی مجلسیں ہوتی ہیں ـــــ

ذکرِ حبیب کے لیے خواتین علیحدہ مجالس سجاتی ہیں، پُر جوش رضا کار گلی گلی اور کوچے کوچے نعت خوانی کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جن میں بچے بوڑھے جوان سبھی شامل ہوتے ہیں اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبّت کا اظہار کرتے ہیں۔

خوشی اور مسرّت کے اس سَیلِ رواں میں جوش و خروش اپنی جگہ درست لیکن فکر و ہوش بھی لازم ہے۔ آنحضور ؐ کی ذاتِ گرامی سے محبّت کا جذبہ ایک ایسا بنیادی جذبہ ہے کہ اس جذبے کے سامنے کسی دوسرے جذبے کی کوئی حقیقت نہیں۔ محبّت کا یہی جذبہ اہلِ اسلام کو دینِ متین کے لیے عظیم کارناموں کی ہمّت اور صلاحیّت عطا کرتا ہے اور انھیں بڑے سے بڑے ایثار اور قربانی پر آمادہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ناموسِ رسُول ؐ کا سوال آتا ہے تو وہ جان، مال، اولاد کسی چیز کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ تاہم محبّت کے اس جذبہ کی نگہبانی کے لیے ادب و احترام بھی واجب ہے کیونکہ رسُولِ اکرم ؐ کی بارگاہ ایسی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

یہ مجموعہ چند ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو عیدِ میلاد النبی ؐ کے سلسلے میں مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ عیدِ میلاد النبی ؐ کی تقریبات ہر سال

منائی جاتی ہیں اور ان تقریبات میں عقیدت و محبت کا اظہار بڑے جوش و خروش سے ہوتا ہے۔ یوں تو ارکانِ حکومت اور عوام سب ان تقریبات کا ہمیشہ سے یکساں ذوق و شوق کے ساتھ اہتمام کرتے اور ان میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن "وزارتِ مذہبی امور" کے قیام کے بعد امسال پہلی مرتبہ عیدِ میلاد النبیؐ کی آمد آمد ہے اس لیے ہماری وزارت نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مجموعۂ مضامین کو استفادۂ عام کے لیے شائع کر دے تاکہ ہمارے عوام خصوصاً ہماری نوجوان نسل کے لوگ شایانِ شان طریقے سے تقریباتِ میلاد النبیؐ کا اہتمام کرنے کے آداب سے پوری طرح آگاہ ہو سکیں۔

کوثر نیازی

اسلام آباد

یکم فروری ۱۹۷۵ء

آرزو دل میں یہ رکھتا ہُوں خُدا پُوری کرے

جب مروں کوثر زباں پر ہو ثنائے مصطفےٰؐ

بابِ اوّل

عیدِ میلادالنبیؐ
کے
مختلف پہلو

- عیدِ میلاد النبیؐ
- عید میلاد النبیؐ کی شرعی حیثیت
- عید میلاد النبیؐ کی مخصوص نفسیاتی کیفیات
- فخر بجا لیکن ذمّہ داریوں کی طرف بھی توجہ دیجیے!

عید میلاد النبیؐ

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگان را خواجگی آموختی

ربیع الاوّل کا مہینہ پوری انسانی تاریخ میں ایک غیر فانی اہمیت کا حامل مہینہ ہے۔ اس مہینے میں وہ ذات بابرکات پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہُوئی جس نے تاریخ انسانی کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا۔ جس نے انسانیت کو پستی سے نکال کر عظمت و رفعت کے آسمان پر پہنچایا۔ جس نے دُکھی دُنیا کو پیغامِ امن و راحت دیا، اُسے دُکھوں اور آلام کا مداوا بخشا۔ اس کی ان بیڑیوں کو کاٹا جس میں وہ صدیوں سے جکڑی

چلی آرہی تھی۔ اس کی پُشت پر سے وہ بوجھ اتارے جس کے نیچے وہ قرن ہا قرن سے دبی جارہی تھی اور اسے ایک ایسا اجتماعی نظامِ حیات دیا جس کو اپنا کر وہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکتی ہے، اور جس میں رنگ و نسل، وطن اور قوم اور امارت و افلاس کی بنیاد پر کوئی تفریق اور امتیاز نہیں ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امّی) جس وقت پیدا ہُوئے ساری دُنیا ضلالت و گمراہی میں سرگرداں تھی۔ خدائے واحد سے مونہہ موڑ کر انسان ہر جگہ ذلیل و خوار ہورہا تھا۔ ہر انسانی معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہُوا تھا۔ اُوپر کا طبقہ زیردست طبقے کا خُدا بنا ہُوا تھا۔ اخلاقی اور اجتماعی امراض پُوری طرح گھر کر چکے تھے۔ ہر طرف جنگل کا قانون رائج تھا اور دھرتی انسان کے خون سے انسان کے ہاتھوں لالہ زار ہورہی تھی۔ ایسے عالم میں رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ایسی تاریک اور مایوس کُن فضا میں آپ پروان چڑھے اور یہی شب و روز تھے جب چالیس برس کی عُمر میں آپ ہدایت الہٰی کا نُور اور حیات انسانی کی کایا پلٹ دینے والا "نسخۂ کیمیا" لے کر غارِ حرا سے نکلے۔ اس نُور سے آپ نے زندگی کی تاریک راہوں کو روشن کیا اور بھٹکتے ہُوؤں کو صراطِ مستقیم دکھایا اور اس "نسخۂ کیمیا" سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ اسے ماسوا سے کاٹ کر خُدائے واحد کے آگے سربسجود کیا۔ ذلّت و خواری کے مقام سے اُٹھا کر عزّت و شرف کی جگہ پر بٹھایا۔ ایک مکمّل و اکمل دستورِ حیات اور آئینِ حکمرانی دیا۔ معاشرت کے آداب سکھائے۔ اقتصاد و معیشت اور تہذیب و اخلاق کے اصول دیے ——

نوعِ انساں کی شیرازہ بندی کی اور ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دیا کہ انسانی تاریخ جس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

سیدالمرسلین کا عالم انسانیت پر بلاشبہ یہ احسان عظیم تھا اور یقیناً وہ دن بڑا ہی اہم تھا جب یہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالمِ آب و گل میں تشریف لائے۔ اس دن کی یاد ہر احسان شناس دِل میں ہونی چاہیے۔ لیکن آپ کی مقدس و مطہر شخصیت محض ایک محسن ہی کی نہیں ہے کہ آپ کے احسان کے معترف اس دن کی یاد منا کر رہ جائیں بلکہ ایک مسلمان کا مرکزِ محبّت بھی ہے۔ یہ محبّت اس کے اسلام و ایمان کا عین تقاضا ہے۔ جس دل میں آپؐ کی محبّت نہیں وہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے اور محبّت بھی وہ جس کے آگے دوسری ساری محبّتیں ہیچ ہو جائیں۔ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک اپنے دعوے ایمان میں صادق نہیں ہے جب تک وہ میری محبّت کو اپنے باپ، اپنے بیٹے اور دُنیا کے سب لوگوں کی محبّت پر ترجیح نہیں دیتا۔"

اور اس محبّت کا سبب وہ دعوتِ حق ہے جسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔ اور آپ کی اپنی ذات جس کا عملی پیکر تھی اور جس کے اس عملی نمونے کے سانچے میں حیاتِ انسانی کا ڈھالا جانا مقصود تھا

اور جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ چنانچہ اس نمونہ زندگی کی اتباع کو بھی بالکل اسی طرح ایمان و اسلام کا تقاضا قرار دیا گیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو تقاضائے ایمان قرار دیا گیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو دعوت میں لایا ہوں اگر کوئی شخص اپنی خواہشات کو اس کا متبع نہیں بناتا تو اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں سے جو اس کی محبت کے دعویدار ہیں کہا ہے کہ وہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے تو میری ذات کے ساتھ ان کی محبت کے دعوے کو کوئی وزن حاصل ہوگا۔

قل ان کنتم تحبون اللہ
فاتبعونی یحببکم اللہ

پس محبوبِ خدا سے محبت اور آپ کو محسنِ انسانیت تسلیم کرنے کا حقیقی تقاضا ہے کہ آپ کی اتباع کی جائے۔ آپ کے جس اسوۂ حسنہ کو اپنانے کا حکم اللہ نے دیا ہے اس کے سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھالا جائے۔ آپ جس نظام زندگی کو اپنے اللہ کی طرف سے لے کر تشریف لائے اور اسے جس طرح نافذ کرنے کا حق ہے نافذ کیا جائے۔ کتاب اللہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو فکر و عمل کی زندگی میں آخری سند تسلیم کیا جائے۔ آپ نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے اسے بے چون وچرا کیا جائے اور جس بات سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے اس سے بلا حیل و حجت باز رہا جائے۔

آج انسانیت پر پھر وہی عالم طاری ہے جو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت اور بعثت کے وقت طاری تھا۔ دُنیا پھر ضلالت اور گمراہی کے اندھیاروں میں کھو چکی ہے۔ انسان انسان کا پھر خُدا بن چکا ہے اور اجتماعی اخلاقی امراض پھر اسی دَور کی طرح انسانی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ جو بیڑیاں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آکر کاٹی تھیں انسانیت کے پاؤں میں پھر ڈال دی گئی ہیں اور جو بوجھ آپ نے انسانیت کی پشت سے اتارے تھے وہ اس پر پھر لادے جا چکے ہیں۔ انسان پھر دُکھی ہے اور اسے اپنے دُکھ درد کے مداوا کی تلاش ہے لیکن وہ اُمّت جس کے پاس یہ مداوا رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ اور اپنے اللہ کی جانب سے لائے ہوئے نظامِ حیات کی شکل میں ہے اور جس کے ایمان اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کا تقاضا ہے کہ وہ اس مداوا سے دُکھی دُنیا کا علاج کرے۔ ہر سال یومِ میلاد النبیؐ منا کر مطمئن ہو جاتی ہے حالانکہ یومِ میلاد النبیؐ اپنے عمل و کردار کا جائزہ لینے اور یہ سوچنے کا دن ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ تعالیٰ نے جو دعوت دے کر مبعوث فرمایا تھا اس پر وہ خود کس حد تک عمل پیرا ہے اور اسے حاجتمند دُنیا تک پہنچانے کا اس نے کیا اہتمام کیا ہے۔ فھل من مدکر !

عید میلاد النبیؐ کی شرعی حیثیت

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

یا یھا الناس قد جآءتکم موعظة من ربکم و
شفآء لما فی الصدور وھدی ورحمة للمؤمنین ۝
قل بفضل اللہ و برحمة فبذلک فلیفرحوا ھو
خیر مما یجمعون ۝

"اے لوگو تمھارے پاس نصیحت اور تمھارے سینوں میں جو (دل) ہیں ان کے لیے شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آچکی ہے۔ پس (اے رسولؐ) کہہ دیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کی بدولت ہے پس اس پر انھیں خوش ہونا چاہیے۔ یہ چیز ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔" (سورۂ یونس ۵۷-۵۸)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے نصیحت، ان کے دلول

کے لیے شفا اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت لاتے والی مقدس اور متبرک ہستی کی عالمِ لاہوت سے عالمِ ناسوت میں تشریف آوری کوئی عام یا معمول کا واقعہ نہیں بلکہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین اور اہم ترین واقعہ ظہور پذیر ہوا وہ جمیع نوع انسانی کے لیے ایک یادگار دن ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے

کہ: وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین

"اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام دنیاؤں کے لیے رحمت بنا کر۔"

وہ مقدس ذات جو تمام دنیاؤں کے لیے رحمت عمومی اور مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت خصوصی ہے وہ جو انسانوں کے لیے اللہ کی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور جس کی تعریف و توصیف خود قرآن حکیم میں جا بہ جا موجود ہے اس سے بڑھ کر انسانوں کے لیے کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی ذات والاصفات فی نفسہٖ ہمارے لیے سب سے بڑی نعمت ہے تو اس نعمت کا اقرار و اعتراف مسلمانوں کے لیے شکرانۂ واجب کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس نعمتِ بیکراں کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اسے مومنوں پر بہت بڑا احسان قرار دیا ہے چنانچہ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عليهم اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

وَالْحِكْمَةَ ۝

"بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ انھی میں سے ایک رسُول مبعوث فرمایا جو انھیں آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا اور قرآن اور حکمت سکھاتا ہے۔ (آل عمران: ۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دُنیا اور عاقبت میں ہزار ہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ان میں سے ہر عطیہ ہمارے لیے اس کا کرم اور مہربانی ہے۔ لیکن رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم کی بعثت ایک ایسی گراں بہا نعمت ہے کہ اس نعمت کے عطیے پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر اپنا احسان جتایا ہے اور اللہ کے احسان کا اقرار اور اعتراف اسی کے فرمان لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ "اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم مہربانیوں میں اضافہ کریں گے" کے مطابق نعمتوں میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہٖ وعلیٰ آلہٖ وسلّم کی تشریف آوری کے بعد ہمیں جتنی مزید نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ سب آنحضورؐ کی برکت سے اور آنحضورؐ کے تصدّق حاصل ہوتی ہیں۔ ان نعمتوں میں مادّی اور رُوحانی، دینی اور دُنیوی، فانی اور باقی، آنی اور جاودانی غرض تمام نعمتیں شامل ہیں۔

انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر

اللہ کی نعمتوں کا ذکر مستحسن اور مستحب ہی نہیں ایک فریضۂ واجب ہے جس کی طرف خود ذاتِ باری تعالیٰ نے اسلام سے پہلے کی اقوام بالخصوص

بنی اسرائیل اور پیروانِ دینِ اسلام کو بار بار متوجہ کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

"یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ..... الخ

"اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو مَیں نے تمھیں بخشی ہیں اور پورا کرو میرا عہد..... (البقرہ: ۴۰)

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ..... الخ

اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو مَیں نے تم کو دیں اور مَیں نے فضیلت دی تمھیں تمام لوگوں پر..... (البقرہ: ۴۷)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ..... الخ

اے ایمان والو یاد کرو اللہ کا انعام اپنے اوپر جب کہ چڑھ آئے تم پر لشکر..... (الاحزاب: ۹)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَهُمْ.....

اے ایمان لانے والو اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو تم پر اس نے کیا جب ایک قوم نے چاہا کہ تم پر دست درازی کرے۔ (المائدہ: ۱۱)

اللہ تعالیٰ کا ذکر "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (سنو! اللہ ہی کے

ذکر سے دل اطمینان حاصل کرتے ہیں) کے مطابق اطمینان قلب کا باعث اور بمصداق "وَاذکُر فَاِنَّ الذِّکرَ تَنفَعُ المُؤمِنِینَ" (اور ذکر کرو کیونکہ ذکر مومنوں کو فائدہ پہنچاتا ہے) فائدے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کرنے والوں کا خود بھی ذکر کرتا ہے جیسا کہ اس نے ارشاد کیا ہے کہ فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولا تکفرون" (پس یاد کرو مجھے میں یاد رکھوں گا تمھیں اور میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو) ہاں جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے اس کا شکر ادا نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے اور کفرانِ نعمت حقیقت میں بخشندۂ نعمت کے کفران کا مصداق ہوتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر وجہِ منفعتِ دین و دُنیا اور باعثِ اطمینانِ قلب ہوتا ہے تو اُس ذات کا ذکر جس پر خود خُدائے تعالیٰ درود اور سلام بھیجتا ہے یقیناً مادی اور روحانی فوائد کا حامل ہو گا۔ پس اس کا ذکر کر کے ہم کیوں نہ ان فوائد سے بہرہ ور ہوں۔" ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا یھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً"۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے اور فرمان خداوندی کے برحق ہونے میں کسی مومن کو شک و شبہ کی مجال کہاں ہو سکتی ہے۔

دُرود و سلام اور اسوۂ حسنہ کی پیروی

کچھ لوگ توحید و سنّت کے معاملے میں مبالغے اور غلو پر عمل پیرا ہوتے

ہیں کہ ذکرِ رسُولؐ اہم نہیں بلکہ اسوۂ رسُولؐ کی پیروی اہم ہے۔ تاہم قرآن حکیم میں رسُول کریمؐ کا ذکر کرنے اور ان پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا ارشاد بھی ہے اور اتّباعِ رسُولؐ کا فرمان بھی ہے۔ اگر ذکرِ رسُولؐ سے اتّباعِ رسول ہی مُراد ہوتا تو دونو کے لیے الگ الگ احکام نہ ہوتے۔ مبالغہ کرنے والے لوگ تو ذکرِ الٰہی کو بھی چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے حالانکہ اطاعتِ الٰہی کے علاوہ ذکرِ الٰہی کے احکام بھی موجود ہیں۔ بلکہ ذکر کے علاوہ ذکرِ کثیر کا حکم ہے۔ اور مومنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مومن وہ ہیں جو بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہُوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیٹ کر تو صرف ذکر ہی کیا جا سکتا ہے نماز ادا نہیں کی جاتی۔

عید میلاد النبیؐ تمام عیدوں کا مبداء ہے

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو عید میلاد النبیؐ ہی تمام عیدوں کا مبداء ہے۔ آنحضورؐ کا ظہور پُر نُور ہُوا تو خلقِ خُدا کو خُدائے تبارک و تعالیٰ کی ہستی کا شعور حاصل ہُوا۔ توحید کا ادراک وحدانیت کا اقرار احکامِ خُداوندی کی تعلیم، عبادات کی تفہیم سب آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدس کی مرہونِ منّت ہیں۔ رمضان شریف اور اس کی فضیلتیں آنحضورؐ کی وجہ سے ہم پر ظاہر ہوئیں۔ اور انہی فضیلتوں سے متمتّع ہونے کے بعد ہم عید الفطر کی مسرّتوں کے مستحق ہُوئے۔ اسی طرح آنحضورؐ نے ہی ہمیں

حج اور قربانی کے طریقے سکھائے جن کی بنا پر ہمیں عید الاضحیٰ کی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ پس جو یوم مبارک عیدین سعیدین کی تقریبات کا مبداء ہے۔ وہ تو کہیں زیادہ مسرت و ابتہاج کا دن ہے اور وہی تو ایسا دن ہے جسے ہم سب سے بڑی عید کا دن کہہ سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی جن آیات کا حوالہ ہم نے اس باب کے آغاز میں دیا ہے ان میں بھی مسرّت و بہجت کے اظہار کا ذکر فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوا کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔ اس مسرّت و بہجت کے اظہار کی بنیاد وہ نصیحت، روحانی شفاء، ہدایت اور رحمت ہے جو آنحضور کی اس دُنیا میں تشریف آوری کی وجہ سے اولاد آدم کو نصیب ہوئی۔ پس اگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ انعاماتِ خُداوندی کے نزول پر شکر واجب ہے تو یقیناً ان نعمتوں کو ہم تک پہنچانے والے کی آمد پر بھی شکر لازم ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ ان نعمتوں کا پہنچانے والا محض ایک قاصد یا پیام رساں نہیں بلکہ خود بھی مجسّم رحمت ہے اور مجسّم رحمت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ تحدیثِ نعمت کے متعلّق خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ۔ اِس حُکم میں مخاطب تو رسُول پاکؐ کی ذات ہے لیکن آنحضورؐ کے توسط سے حُکم تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور تمام زمانوں پر محیط ہے اور اسوۂ رسُول کی پیروی میں ہم پر تحدیثِ نعمت لازم ہے۔

اپنی ذات کے متعلّق آنحضورؐ کا ارشاد

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ ترمذی میں بروایت حضرت عباسؓ مروی

ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں محمدؐ ہوں عبداللہ کا بیٹا اور عبدالمطلب کا پوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے اچھے گروہ میں بنایا یعنی انسان بنایا۔ انسانوں میں فرقے پیدا کیے عرب اور اہلِ عجم اور مجھے اچھے فرقے یعنی عرب میں بنایا۔ پھر عرب میں کئی قبیلے بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے قبیلے میں بنایا یعنی قریش میں۔ پھر قریش میں کئی خاندان بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے خاندان میں پیدا کیا یعنی بنی ہاشم میں۔ پس میں ذاتی طور پر بھی سب سے اچھا ہوں اور خاندان میں بھی سب سے اچھا ہوں۔

لہٰذا اس افضل ترین نوعِ بشر کے یومِ ولادت پر اظہارِ مسرت کرنا اور آنحضورؐ کی مدح و توصیف بیان کرنا یقیناً ایک نہایت مستحسن عمل ہے۔

اکابر علمأ کی آرأ اور عمل

قرونِ اولیٰ سے اکابر علمائے اسلام یومِ ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کو خیر و برکت کا دن مانتے اور اسے عید سعید کی طرح مناتے چلے آئے ہیں۔ اور ان اکابر علمأ میں وہ زعمائے ملت بھی شامل ہیں جو ارتکابِ بدعت کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے بلکہ جن کی مبارک زندگیاں بدعات کو ختم کرنے اور سئیات کے خلاف جہاد کرنے میں گذری ہیں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں "میں ہر سال ایام مولد شریف میں کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا

کرتا ہُوں۔ ایک سال قحط کی وجہ سے بُھنے ہُوئے چنوں کے سوا کچھ میسّر نہ ہُوا۔ مَیں نے وہی چنے تقسیم کر دیے۔ رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت سے مشرف ہُوا تو کیا دیکھتا ہُوں کہ وہی بُھنے ہُوئے چنے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے رکھے ہُوئے ہیں اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ان چنوں سے بہت مسرور اور خوش ہیں۔" (الدّار الثمین۔ ص۔۸)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کا خانوادہ برِصغیر کے اکابر علمأ میں بہت بلند درجات کے مالک ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مَیں میلاد کے روز مکّہ معظّمہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مولد مبارک میں تھا۔ اس وقت لوگ آپؐ پر درود و سلام بھیج رہے تھے اور آپ کی ولادت کا ذکر کر رہے تھے اور وہ معجزات بیان کر رہے تھے جو آنحضورؐ کی ولادت کے وقت ظاہر ہُوئے تھے (مثلاً لات و ہُبل کا گرنا، کسریٰ کے محل کے کنگوروں کا گرنا اور فارس کے آتشکدہ کی آگ کا یک بیک بجھ جانا) تو مَیں نے اس مجلس میں انوار و برکات دیکھے اور جب ان انوار کے متعلّق غور کیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ یہ انوار ان ملائکہ کے ہیں جو ایسی مجالس اور مشاہد پر مقرر ہوتے ہیں۔

(فیوض الحرمین — ص۔ ۲۷)

اسی طرح شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ماثبت بالسّنّۃ میں فرماتے ہیں:

"شب میلاد مبارک بلاشبہ لیلۃ القدر سے افضل ہے اس لیے کہ میلاد کی رات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ظہور کی رات

ہے اور شب قدر حضورؐ کو عطا کی گئی ہے ..... لیلۃ القدر نزول ملائکہ کی وجہ سے مشرّف ہوئی اور لیلۃ المیلاد بنفسِ نفیس حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ظہور سے شرف یاب ہوئی"۔

(ماثبت بالسنۃ ۔ ص ۔ ۸۰)

میلاد النبیؐ کی تقریب کے متعلّق اسی قسم کے خیالات شاہ عبدالعزیز دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی کے بھی ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی "فیصلہ ہفت مسئلہ" میں فرماتے ہیں :

"اور مشرب فقیر کا یہ ہے کہ محفل مولد میں شریک ہوتا ہوں بلکہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذّت پاتا ہوں"۔

(فیصلہ ہفت مسئلہ مطبوعہ قیومی پریس کانپور۔ ص ۔ ۵)

البتہ غیر مشروع عمل جو میلاد النبی کی محافل میں راہ پا گئے ہوں ان کو ترک کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں موصوف فرماتے ہیں :

"اگر کسی عمل میں عوارض غیر مشروع لاحق ہوں تو ان عوارض کو دُور کرنا چاہیے نہ یہ کہ اصل عمل سے انکار کر دیا جائے۔ ایسے امور سے انکار کرنا خیر کثیر سے باز رکھنا ہے"۔

یہ تو عصر حاضر کی بات ہے۔ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم کے زمانہ مبارک سے لے کر آج تک تقریباً چودہ سو برس کے طویل عرصے کے دَوران علمائے کرام اور شعرائے شیریں مقال آنحضورؐ کی شان میں

خطبات دیتے اور نعتیہ قصائد کہتے رہے اور جو چیز اتنے طویل عرصے سے علی التواتر تمام ممالک کے مسلمانوں میں مروّج اور مقبول چلی آ رہی ہو اس کے مستحسن ہونے میں کیونکر شک کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدیح رسول اللہ صلعم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضورؐ کی شان میں نعتیہ قصائد لکھے اور حضورؐ کی بارگاہ میں پڑھے اور حضورؐ نے ان اشعار پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ حضرت حسان کا ایک نعتیہ قصیدے کے دو اشعار تو آج تک زبان زد خاص و عام ہیں۔

واحسن منک لم تری قط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرءً من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشآءُ

دیکھیے ان نعتیہ اشعار میں بھی حضورؐ کی ذات کی توصیف ہے اور یہاں بھی حضورؐ کی ولادتؐ اور خلقت کا ذکر کیا گیا ہے گویا یہ نعتیہ اشعار بھی میلاد النبیؐ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر جب ایک موقع پر حضورؐ مدینہ شریف میں تشریف فرما ہوئے تھے تو خیر مقدم کے لیے انصار کی صاحبزادیاں طَلَعَ بَدرُ عَلَینَا من ثنیاتِ الوداع پڑھ رہی تھیں۔ یہاں بھی حضورؐ کے رُوئے مبارک کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ بھی حضورؐ کی توصیفِ ذات ہے۔ اور آنحضورؐ نے اس

پر بھی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ جب اپنی ذات کی مدح و توصیف کے سلسلے میں آنحضورؐ کا اپنا عمل اتنا واضح اور صاف ہے تو اس کے لیے کسی مزید سند کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے اور آج بھی اگر ہم میلاد النبیؐ کی تقاریب منعقد کر کے حضرت حسان بن ثابت کی پیروی میں آنحضورؐ کے شمائل و خصائل کی توصیف کرتے ہیں تو ہمارے اس عمل کے مشروع اور مستحسن ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔

عید میلاد النبیؐ کی مخصوص نفسیاتی کیفیات

عید میلاد مسلمانوں ہی کے لیے نہیں کُل کائنات کے لیے برکتوں اور رحمتوں کو جلو میں لے کر آ پہنچی ہے۔ پاکستان کے مسلمان اس عظیم دن کا استقبال جس جوشِ محبت اور خلوص کے ساتھ کریں کم ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دن ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن ہے مسلمانوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وُہ دُنیا کی تمام قوموں سے زیادہ اس پیغام کے قریب ہیں جو خدائے ارض و سما نے ارض و سما میں بسنے والی ہر مخلوق کی بہتری اور بھلائی کے لیے نازل فرمایا اور پاکستان کو یہ فخر ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا اس پیغامِ عظیم کی تجربہ گاہ قرار پایا۔ ہمیں اس بات کا نہایت ندامت کے ساتھ اعتراف ہے کہ پاکستان ابھی تک اپنے مقصدِ اصلی کو حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بعض حلقوں سے یہ آواز بھی اُٹھے گی اور پوری کی پوری غلط نہ ہو گی کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ابھی ہمارا پہلا

قدم بھی نہیں اُٹھا[1]۔ اور ہم یہ قدم اٹھاتے ہوئے جھجک رہے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کے کسی ایک فرد کے دل میں بھی اپنے اس مقصد کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہے۔ سرزمین پاک کا رہنے والا ہر آدمی اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے کہ یہ مُلک اسلام کے نام پر اسلام کی سربلندی کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور جب ہم نے اس کے لیے ووٹ دیے، مال اور جان کی قربانیاں دیں، ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تصور شدائد اور مصائب کو لبیک کہا تو ہمارے دل میں یہ خیال پُوری طرح سے بسا ہُوا تھا کہ ہم اس مملکت کو دُنیا کے سامنے اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کریں گے کہ اسلام کے بتائے ہُوئے اصُول و قوانین پر آج بھی ایک جدید، فعّال اور موثّر مملکت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ایک دن آئے گا جب یہ مملکت دوسری تمام مملکتوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جا سکے گی اور یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ مغربی اور مشرقی نظریاتِ سیاست اس مکمل اور اکمل نظریۂ حیات کے مقابلہ میں ہیچ اور غیر موثّر ہیں اس لیے ہماری آج کی ناکامیاں باعثِ ندامت تو ہو سکتی ہیں لیکن حوصلہ شکن نہیں۔ ہمیں صرف یقین ہی نہیں ہمارا ایمان ہے کہ ایک نہ ایک دن ہماری جھجک دُور ہو گی اور

۱۔ خُدا کا شکر ہے کہ موجودہ عوامی حکومت نے آئین میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دے کر اور دین کے معاملے میں کئی قابلِ قدر خدمات سرانجام دے کر پہلا قدم اٹھانے کی سعادت حاصل کر لی ہے۔

ہم اپنے اصل مقصد کی طرف قدم اُٹھا سکیں گے۔

یہی جذبہ اور یہی عزمِ مصمم جو ہر دل کا مرکزی نقطہ ہے عیدِ میلاد کے دن مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے اپنا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلوص و عقیدت کے اس اظہار میں بعض اوقات ہم سے ایسی ناروا باتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں جو اس عظیم پیغام اور اس پیغام کو لانے والے صلی اللہ علیہ وسلّم کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ہم بعض اوقات محبت کی سرمستی اور بے خودی میں بعض ایسی حدود پھلانگ جاتے ہیں جن حدود کے اندر رہنے ہی میں ہماری فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ ہم بعض اوقات اپنے اظہارِ عقیدت اور دوسری قوموں کے "اظہارِ عبودیت" کے درمیانی فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اور بجا طور پر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم نے ان تمام حدوں کو توڑ دیا ہے جو ہم کو دوسروں سے ممتاز کر رہی تھیں لیکن ان تمام کوتاہیوں تمام نااندیشیوں اور ان تمام بے خبریوں کے باوجود وہ جذبہ یقیناً ہے بے انتہا خوبصورت، بے انتہا دلکش اور بے انتہا ولولہ انگیز، جو ان سرمستیوں اور خود فراموشیوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ کائنات کے ہادی، عالموں کے راہنما جن و بشر کے بے بدل قائد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ محبت کا جذبہ ہے۔ یہ صرف ایک انسان کے ساتھ نہیں پوری کائنات کے ساتھ محبت کا جذبہ ہے۔ یہ ایک فرد کے ساتھ اظہارِ عقیدت نہیں پوری عالمی برادری کی فلاح و بہبود کے ساتھ اظہارِ عقیدت کا انداز ہے۔ جب ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے محبت کر رہے ہوتے ہیں تو ہم پوری کائنات کے

ساتھ اس محبت کا ثبوت دے رہے ہوتے ہیں، جس کا ثبوت خود خدا نے مہیا کیا ہے۔ اس کائنات گیر اور عالم شکار محبت کے جذب و شوق میں کوتاہیوں کا سرزد ہو جانا غیر فطری بات نہیں۔ ان کو حدود کے اندر محدود کیا جا سکے اور کوتاہیوں کی تعداد میں جتنی کمی ممکن ہو وہ ہو جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے، لیکن اس خوبصورت اظہارِ عقیدت کو برا اور غلط کہنے کو ہمارا دل تیار نہیں ہوتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ محبت کی ان کوتاہیوں کو بُرا کہنے اور ان کی مذمت کرنے کے بجائے دینی حلقوں کو اس نفسیاتی فضا سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ بے خبر ہوں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مبارک سیرت ہی مسلمان کا وہ حقیقی لنگر ہے جس نے چودہ سو سال کے لاتعداد طوفانوں میں اس کشتی کو قائم اور دائم رکھا۔ یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور اس دعویٰ کی تردید کسی سے ممکن نہ ہو گی کہ دُنیا کی تمام ملل میں ملتِ اسلامیہ وہ واحد ملت ہے جو اپنے مرکزِ اصلی پر جمع ہے اور جس کے اجتماع کو انتہائی تند اور تیز مخالف ہُوائیں بھی منتشر نہیں کر سکیں۔ باقی تمام ملتیں ایک ایک کر کے منتشر ہو گئیں۔ نام کو تو مسیحیت بھی برقرار ہے اور یہودیت بھی لیکن دونوں ملتوں کے سربراہ آج یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ خود ملت کے افراد کی کسی خصوصی خوبی میں پوشیدہ نہیں بلکہ اس کی واحد وجہ سیرتِ رسُول ؐ کے ساتھ اس ملت کا والہانہ اور مجنونانہ لگاؤ ہے۔ عید میلاد کے موقع پر قوم نفسیاتی طور پر سیرتِ پاک

کے تمام اثرات قبول کرنے کے لیے پُوری طرح تیار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس موقعہ پر ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ علمائے اُمّت اسے سیرتِ رسُول کے متعلق کچھ بتائیں اور نیکی کی راہ پر ڈالیں۔ اس موقع پر اگر ہم اس نفسیاتی کیفیت کے اچھے پہلوؤں کو مثبت طریقوں سے استعمال کرنے کے بجائے اس نفسیاتی کیفیت کی بعض کوتاہیوں اور خامیوں کو گنانے میں مصروف ہو جائیں اور اس کی مذمت کرنے پر اپنا اور ملّت کا وقت ضائع کرنے میں لگے رہیں تو یہ چیز غلط ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے قانون ساز لکیر کے فقیر ہیں۔ وہ اسلام کو نعرے کی حد تک محدود رکھنے ہی کو مناسب سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کی ہمّت اپنے دلوں میں نہیں پاتے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قانون سازوں کو ہمّت دے اور وہ گزرے ہُوئے سانپ کی پٹی ہوئی لکیر کو پیٹنے کا کام ترک کر کے صحیح معنوں میں قانون سازی کا کام شروع کر سکیں۔

فخر بجا لیکن ذمّہ داریوں کی طرف بھی توجّہ دیجیے!

افراد کے معیارِ زندگی کو اگر معیار سمجھا جائے تو تیرہ چودہ سو سال کا عرصہ خاصا لمبا معلوم ہوگا۔ اگر اس سے ذرا آگے قدم بڑھایا جائے اور قوموں کی زندگی کے معیار کو معیار بنا لیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو نسلوں میں سمٹ جائے گا اور اس کے بعد کا احساس بہت کم ہو جائے گا، لیکن اگر اس دُنیا کو ایسی عصر ساز تحریکوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے جو عالم انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے جاری ہوئیں اور جن کے اثرات نے انسانی تاریخ کے دھارے اس طرح موڑے کہ انسان موجودہ دَور تک ترقی کی منزلیں طے کرنے میں کامیاب ہو سکا تو یہ طویل اور بعید عرصہ کل کی بات معلوم ہوتا ہے اور آدمی حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک فرد واحد کی آواز میں یہ اثر کیسے اور کیونکر پیدا ہُوا کہ اس آواز نے نہایت قلیل مدت میں تاریخ کے متوقع راستوں کو بدل کر انسان کو اس راستے پر ڈال دیا ہے کہ اس کی تاریخ

کی کوکھ سے مشتری شکار دَور جنم لے سکے۔

لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسا ہی ہُوا اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ آج سے چودہ سو برس پہلے کی دُنیا عجیب وغریب تھی۔ یورپ ایک وسیع و عریض خطۂ زمین تھا جسے چند خاندانوں یا قبیلوں نے آپس میں بانٹ لیا تھا اور جو آپس میں آج کے عام دیہاتی زمینداروں کی طرح پانی کی باری یا مویشیوں کی کمی بیشی پر لڑا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی کو کپاس کا علم نہ تھا۔ جانوروں کی کھالیں لباس کے نام سے اوڑھی جاتی تھیں۔ انگریزی کا مشہور ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیئر ملکہ الزبتھ اوّل کے عہد کا انگریز اور سترھویں صدی عیسوی کا انسان ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی کہ وہ ایک تکیہ حاصل کر سکے جس پر سر رکھ کر سونے کی عیاشی اس کے لیے مقدر ہو سکے۔ اسی ایک واقعہ سے آپ انگلستان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا اندازہ کر لیجیے اور اس سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کی زندگی کو قیاس کر لیجیے۔ تیمور گورگان نے تیرھویں صدی عیسوی میں ماسکو پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ماسکو لکڑی کے پانچ سو گھروندوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے رہنے والوں کو برفانی طوفانوں سے بچنے کی کسی ترکیب کا کوئی علم نہ تھا۔

اس سے تقریباً سات سو سال پہلے آج کی دُنیا کے اس عظیم شہر کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت کا قیاس اس ایک واقعہ سے کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ یہ آج سے چودہ سو برس پہلے کی مغربی دُنیا ہے۔ دو ہزار سال پہلے

ہندوستان میں بھی ایک سیاسی طاقت پیدا ہوئی جس نے اشوک اعظم کے نام سے مختلف سیاسی وارداتوں میں بٹے ہوئے اس خطۂ زمین کو چند دنوں کے لیے ایک سیاسی وحدت میں بدل دیا، بے شمار ترقیاں ہوئیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس عہد میں سونا اچھالتے گزر جائیے چوری چکاری کا کسی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر آدمی روٹی کھاتا تھا، یہاں تک کہ براہمن دَور کی وہ ہولناک صُورت بھی باقی نہ رہی تھی جسے ذات پات کی تقسیم کے گھناؤنے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان خواہ مفتوح غلام "شودر" ہو یا فاتح اور مالک کھشتری اور اس کا دماغ برہمن۔ سب یکساں تھے اور مہاراج ادھیراج سب کی سنتے اور سب کی مدد کو پہنچتے تھے۔ آریہ نسل کے متعیّن اور معروف اصولوں کے ہولناک انسان کُش مظالم کی داستان کے درمیان یہ داستان بڑی خوش آیند اور انتہائی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جلتے صحرا کے درمیان نخلستان کیسے۔ لیکن یہ کتنا کم سواد اور تھوڑی عمر والا دَور تھا اور اس کے بعد کیا ہُوا؟ مہاتما بدھ کو کیوں خداؤں میں شامل کر کے خدا کا درجہ دے دیا گیا؟ سیاسی زبان میں ایک چھوٹی سلطنت کو بڑی سلطنت نے اپنے اندر ضم کر کے اپنا اٹوٹ انگ بنالیا۔ مذہبی زبان میں برہمومت کی دیومالا میں ایک اور دیوتا کا اضافہ ہو گیا۔ بدھ مہاراج۔

ان معنوں میں ہندومت کا اٹوٹ انگ بنا کر یہ بھی ہندوؤں کے لاتعداد فرقوں میں سے ایک فرقے کا معبود ہے۔ سماجی زبان میں یہ نہیں —— یعنی بدھ کے ماننے والے برہمن اور کھشتری کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔ برہمن اور کھشتری اس کے ہاتھ کا پکا نہیں کھائیں گے۔ ان کے کنوئیں کا پانی نہیں

پیٹس گے۔ کوئی بودھ ان کے چوکے میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ ان حد بندیوں کے بعد بدھ مت ہندو مت کا اٹوٹ انگ ہے۔ تاریخی طور پر بودھ مت تحریک کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ برہمن سامراج نے بجا طور پر اعلان کر دیا کہ بودھ مت اب کوئی مسئلہ نہیں۔ اس نظریۂ حیات کو بانجھ کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی کوکھ سے کوئی اشوک اعظم جنم نہیں لے گا اور یہی ہُوا بھی، کوئی اشوک پیدا نہیں ہُوا۔ شودر ذلّتوں کی انتہائی پستیوں تک اتار دیے گئے۔ برہمن عزّت کے بلند سے بلند تر سنگھاسن پر قابض ہو گیا اور کسی بودھ نے مہاتما بُدھ کے نظریات کے نام پر اس انسان کُشی کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھائی۔

اِسے دُنیا کا تیسرا مہذب اور ترقی یافتہ حصّہ وہ تھا جسے آسانی کے لیے ایران کی سلطنت کہا جاتا ہے۔ یہ متعدد جغرافیائی وحدتوں کے مجموعے کا نام تھی جو درفش کاویانی کے سائے میں متحد کر دی گئی تھیں۔ اس کا سب سے شاندار دَور نوشیرواں عادل کا دَور ہے جس کی ستائش میں شیخ سعدی شیرازی جیسے معقول اور غیر جانبدار شاعر نے اپنا زورِ بیان صرف کیا اور اس حکایت کو زندہ جاوید بنا دیا کہ نوشیرواں نے ایک غریب بُڑھیا کی جھونپڑی کی خاطر اپنے محل کی کجی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ لیکن اس حکایت کی مقبولیت کے عقب میں جو بات پنہاں ہے وہ یہ بھی ہے کہ نوشیرواں عادل سے پہلے اور بعد ایسی کئی غریب بوڑھی عورتیں دب کر رہ گئی ہوں گی جن کی رات

کے مقابلے میں نوشیرواں کا یہ چراغ سورج کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ اس حکایت کے پس منظر میں بے انصافی اور جبر و استحصال کی مکمل تصویر تصور کی جا سکتی ہے۔

اس دنیا کا چوتھا مہذب ملک یونان ہے، جسے یورپ والے اپنا کہتے ہیں اور ایشیا والے اس پر اپنا دعویٰ جتاتے ہیں' یہ اس کی عظیم مقبولیت کی دلیل ہے اور یہ مقبولیت بے بنیاد نہیں اس میں ارسطو، بقراط اور افلاطون جیسے قائدین فکر پیدا ہوئے جنھیں آج کی دُنیا بھی اپنا استاد مانتی ہے۔ انھوں نے سیاست، تاریخ، سائنس، حکمت، اقتصادیات، نوآبادیات غرض ماڈرن زندگی کے ہر شعبے کے لیے راہیں مہیا کیں' حد یہ ہے کہ ہمارے یہاں درسِ نظامی میں ان کے فلسفہ و منطق کے اصول اور مبادیات کی تعلیم آج بھی دی جاتی ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں عالمِ انسانی کی قیادت کا حق ادا کر دیا، لیکن یہ دُنیا تھی کیا؛ وہ کیسا معاشرہ تھا جس نے کئی ایک غیر فانی نام تاریخ میں محفوظ کر دیے، یہ الگ داستان ہے۔ اس میں مفتوح قومیں اس طرح غلام بنائی گئیں کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ جمہوری ریاست کے شہری صرف حکمران قوم کے افراد تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو ووٹوں کے ذریعے مفتوح اقوام پر حکومت کرتے تھے۔ ان کے ووٹ ایسے قانون بناتے تھے جو مفتوحوں پر تو نافذ العمل ہوتے تھے مگر فاتحین پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ مفتوح اقوام کی اکثریت پر فاتح قوم کی متحدہ آمریت

کو جمہوریت کے نام سے مسلط کیا گیا تھا۔ یہی یونان کی شہری جمہوریت تھی مفتوح قوم کے سر بازار نیلام ہوتے ہوئے ناموس بھیڑ بکریوں کی طرح بکتی ہوئی جوانیاں، انصاف سے مایوس ہونے والے مفتوحوں کی خودکشی، ان کا قتل عام اور ان کی زندگی، بیزار زندگی کے پس منظر میں سقراط کے مقالے اور افلاطون کی "جمہوریت" کا مطالعہ بڑے بڑوں کے پتّے پانی کر دیتا ہے اور یہ بڑے بڑے خیالات یکسر لغو اور بے معنی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ رومیوں کی عظیم سلطنت اس کا منطقی نتیجہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

یہ وہ دُنیا تھی جو آج سے چودہ سو برس پہلے تک قائم تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ذرا تصور کیجیے کہ یہ دُنیا انسانی تاریخ کے لیے کیا خطوطِ عمل متعین کرتی ہے اور اس سے کیا یہ قیاس ہوتا ہے کہ آنے والی دُنیا اگر انہی خطوط پر چلتی رہی تو اس کا رنگ کیا ہوگا؟ اگر آپ خود غور کریں تو اس کا نقشہ ہم سے بہتر قائم کر سکیں گے۔ ہماری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے یہ ہے کہ یہ دُنیا بالا دستوں کی جنّت اور زیر دستوں کے لیے دوزخ ہونی چاہیے۔ یہ طاقت کی دُنیا ہے۔ جو طاقتور ہے وہ کمزور کو غلام بنالے گا۔ فاتح مفتوح کو کچل کر شودر بنا دے گا۔ انسان انسان کو اس طرح نگل جائے گا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔

اس طرح کی عالمی فضا کے درمیان آج سے صرف چودہ سو سال پہلے عرب کے دور افتادہ اور الگ تھلگ علاقے میں مکّہ کے ایک تاجر کے یہاں

ایک بچہ پیدا ہُوا جس نے یتیمی میں آنکھ کھولی غریبی میں پل کر جوان ہُوا اور جب نبوت کے نورِ عظیم پر سرفراز ہُوا تو اس کی آواز نے ان سارے تصورات کو باطل کر دیا اور دُنیا کا متوقع نقشہ بدل گیا۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔

اس بدلے ہُوئے نقشے میں بعض عجیب وغریب چیزیں نظر آتی ہیں۔

۱۔ دُنیا میں کوئی ایک قوم باقی نہیں جو وحدانیت کی قائل نہ ہو اور بُت پرستی کو قابلِ فخر مذہب سمجھتی ہو۔ یہاں تک کہ نہایت سخت جان برہمو دھرم بھی ہتھیار ڈال رہا ہے۔

۲۔ دُنیا میں کوئی ایک قوم بھی باقی نہیں جو کم از کم نظری طور پر انسان پر انسان کی برتری کو بطورِ حق قبول کرے اور اس کا اعلان کر سکے، انسانی برادری کا تصور بطور فلسفۂ زندگی کے پُوری دُنیا میں راسخ ہو چکا ہے۔

۳۔ دُنیا میں کوئی ایک قوم باقی نہیں جو بلند آواز سے دعویٰ کر سکے کہ وُہ دوسری قوم کے مال کو "بغیر حق" غصب کر لینے کی حقدار ہے اور اس لیے حقدار ہے کہ وہ طاقت ور ہے۔ گویا طاقت کا قانون غیر مستعمل نہیں تو غیر مقبول ضرور ہو چکا ہے۔ اور عمل کے دائرے میں نہیں تو اعلان اور بیان کے دائرے میں طاقت کے قانون پر فخر کرنے والا کوئی باقی نہیں۔ آج کی دُنیا میں نوشیروانِ عادل کی کہانی مقبول نہیں ہو سکتی۔ یہ معمول کا حق ہے، جس میں تعجب انگیز کہانی بننے کا کوئی مواد باقی نہیں رہا۔

۴۔ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو آئین کے بغیر حکومت کرے۔ خود اپنے آپ پر آئین کے بغیر حکومت قائم کرنے والی قوم اقوامِ عالم کی برادری میں نکو سمجھی جائے گی اور برداشت نہیں کی جائے گی۔

یہ چند بنیادی تبدیلیاں ہیں اور اس فہرست میں اضافے کی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ یہ ہم لوگوں کی کمزوری اور بدبختی ہے کہ دُنیا کی اکثریت اس ہستی مقدس و مطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت و راہنمائی حاصل کرنے کا اعتراف کرنے سے ہچکچا رہی ہے، لیکن اس حقیقت سے تاریخ عالم کا کوئی معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑا طالب علم انکار نہیں کرسکتا کہ ہادی کا اقرار و اعتراف کرنے کی سعادت سے محروم ہونے کے باوجود دُنیا "ہدایت" پر عمل کر رہی ہے۔ اور آج کی ترقی یافتہ قوموں میں کوئی ایک قوم ایسی نہیں جس نے ان ہدایات پر شعوری یا غیر شعوری طور سے عمل کیے بغیر ترقی کی ہو۔ یہ بے مثال اور غیر فانی معجزہ آج کی تاریخ کا بے حد نمایاں پہلو ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ہر جگہ عمل ہو رہا ہے۔ یہاں تک رُوس اور چین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پچھلے ہی سال عوامی جمہوریہ چین کے عظیم راہنما ماؤزے تنگ ایک امریکی اخبار نویس سے یہ کہتے سُنے گئے تھے کہ "میں اپنے خدا سے ملنے کی تیاریاں کر رہا ہوں"۔ یہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی کامیابی کی بڑی نمایاں مثال ہے۔ اس کلمۂ طیب کے دوسرے حصے "محمد رسول اللہ" تک آنے کے لیے دُنیا کو ابھی وقت کی ضرورت ہے اور جس طرح اس زمانے میں مشرق اس سے بہت زیادہ آباد، بہت

زیادہ ترقی یافتہ کہیں زیادہ مہذب اور فکری میدان میں بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا۔ مثلاً چین میں کنفیوشس پیدا ہو چکا تھا اور اس کی تعلیمات تقریباً ایک ہزار سال تک چینی ذہن کی تربیت کرتی رہی تھیں۔ چین کے جدید مورخین کے دعووں کے مطابق چین میں کاغذ تیار ہو چکا تھا۔ اور تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا، شعری ادب ترقی کر چکا تھا، ریشم کا کپڑا تیار ہونے لگا تھا۔ چین ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں سے عالمی تجارتی استعمار کا دور شروع ہوتا ہے لیکن یہ دُنیوی اور فکری ترقی کا مفہوم اولادِ آدم کے نقطۂ نظر سے کیا تھا؛ یہ بالکل مختلف کہانی ہے۔ کنفیوشس کا فلسفہ مزارع کو زمیندار کا، مزدور کو کارخانے دار کا، رعایا کو درباری امیروں کا اور ان کی وساطت سے شہنشاہ معظم کا غلام بنانے کے کام میں اس طرح جوت دیا گیا جس طرح بے زبان بیل ہل میں جوت دیا جاتا ہے۔ اس فلسفے نے بڑے کے احترام کے نام پر چھوٹے کو ایسی اخلاقی زنجیروں میں کس دیا کہ وہ بڑے کی ہر بے انصافی اور طاقت ور کے ہر استبداد کو خاموشی سے سہہ جائے اور زبان سے اُف تک نہ کرے۔ کنفیوشس نے یہ کہا تھا یا نہیں، یہ الگ موضوع ہے لیکن بالادست نے اسے یہی بنا دیا۔ اس سے جدید اور قدیم چینی مورخ انکار نہیں کر سکتے۔ مُلک کی اَسّی فی صد اکثریت بیس فی صد اقلیت کی اقتصادی غلامی میں اس طرح جکڑ دی گئی کہ ہزاروں انقلابات اس اقتصادی جبر و استحصال کا کوئی علاج نہ کر سکے اور اسّی فیصد آبادی بیکسانہ اور بے رحمانہ غلامی میں صدیوں

تک اپنی زندگی اسی طرح گزارنے پر مجبور ہوئی کہ ایک گھر کے چار افراد ہیں تو صرف ایک جوڑا کپڑا گھر میں موجود ہے۔ ایک فرد اس ایک جوڑے سے تن ڈھانپ کر مزدوری کے لیے باہر نکلتا ہے اور باقی کے تین افراد نیم برہنگی کے عالم میں جھونپڑے میں بند رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ریشم کی دریافت اور ریشمی کپڑے کی بُنت میں ترقی، کاغذ کی دریافت، تاریخ نویسی کی ابتداء اور برآمدی تجارت کے لیے نئے راستوں کی دریافت کس قدر بے معنی اور بے مصرف معلوم ہوتی ہے۔ چین اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود یورپ سے ایک قدم آگے معلوم نہیں ہوتا۔

اس دَور کی دُنیا کا دوسرا ترقی یافتہ ملک ہندوستان تھا۔ آج کا بھارتی مورخ بڑی آن بان سے ہندوستان کی بے پناہ ترقیوں کا ذکر کرتا ہے اور اس کو یقیناً ان ترقیوں پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان کی مٹی نے اس مُلک کے غیر ملکی حاکموں میں سے ایک حاکم کو مہاتما بُدھ کے نام سے تاریخ کی وسعتوں میں اُچھال دیا تھا۔ اس نام نے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسان دوستی کا غلغلہ بلند کیا اور لاتعداد تعداؤں کی اس دُنیا میں ایک ایسا بے خُدا معاشرہ پیدا کرنا چاہا جو خُدا کے وجود سے حتمی اور قطعی طور پر انکار کر دے۔ اور انسانی جبلّت کے نیک پہلو پر انسانی فلاح و بہبود کا تاج محل تعمیر کر لے۔ اس ہندوستان میں اس نظریاتی قوت کے تحت آج سے صرف

ایک ہزار سال پہلے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کلمہ طیبہ کا ایک حصہ اس طرح پوری دُنیا کا جزوِ ایمان بن جائے گا۔ اسی طرح آج یہ دعویٰ کرنے میں سب کو تامل ہے کہ اس کے دوسرے حصے پر بھی جلد عمل ہوگا لیکن ہم علی وجہ البصیرت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا ہوگا۔ تاریخ کے وہ دھارے جنھیں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس رُخ پر موڑا گیا تھا اگر ایک حصے تک پہنچ سکتے ہیں تو دوسرا حصہ زیادہ دُور نہیں سمجھا جاسکتا۔

۷ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ تاریخِ عالم کے دھاروں کا رُخ پلٹ دینے والے کا یوم ولادت منانے کی سعادت ہمیں حاصل ہو رہی ہے ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہوگا، دُنیا کی کسی قوم یا دُنیا کے کسی فرد کے لیے اس سے زیادہ فخر کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ ایسے عظیم ہادی کی تنظیمِ ہدایت کا ایک رکن ہے جو پوری دُنیا کے فکری ڈھانچے کو بدلنے اور عالمِ انسانی کو انصاف کے ترازو میں مساوی کر دینے کے لیے پیدا ہوا اور جس نے اپنا مقصدِ حیات اس حسن و خوبی سے معین فرمایا کہ کوئی بڑے سے بڑا دشمن اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ یقیناً بڑے فخر کی بات ہے لیکن اس فخر کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سعادت کی وجہ سے ہم پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں اور جب تک ہم ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے یہ فخر و ناز ہمیں زیب نہیں دے گا۔

دُنیا کی محبّت ہے نہ کچھ یادِ بُتاں ہے
پھر سُوئے حرم قافلۂ شوق رواں ہے

بابِ دوم

آنحضورؐ کی جامع صفات شخصیّت

- انقلابِ عظیم کے داعی
- انسانِ کامل
- خُلقِ حسنہ
- رحمتِ عالم
- حقوقِ انسانی کا اوّلین عالمی منشور
- تجھی پہ ختم ہے رُوح الامیں کی نامہ بری
- سرکارِ دو عالمؐ کی عسکری قیادت
- حضورؐ طبِّ عربی کے بانی تھے

انقلاب عظیم کے داعی

طلوعِ اسلام سے قبل کا عرب پشت ہا پشت کی عداوتوں اور خون آشام دشمنیوں کے لحاظ سے تاریخ انسانی میں جو شہرت رکھتا ہے وُہ تاریخ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا، دنگا فساد اور قتل و غارت گری کرنا عربوں کا عام شیوہ تھا۔ بسا اوقات معمولی سے مسئلہ پر قبائل کی تلواریں میان سے باہر آجاتیں اور پھر جنگ شروع ہوتی تو الامان والحفیظ، بنو بکر اور بنو تغلب عرب کے دو مشہور قبیلے تھے۔ ایک چھوٹی سی بات پر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہُوا، یہاں تک کہ بات تکرار سے میدانِ کارزار تک جا پہنچی اور نصف صدی تک یہ قبیلے باہم برسرِ پیکار رہے۔

یہ کیفیت تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری رسُول احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ آپ ہی کی

تشریف آوری کا اعجاز تھا کہ نہ صرف عرب کے یہ متحارب اور متصادم قبائل شیر و شکر ہوئے بلکہ آپ نے دریاؤں اور پہاڑوں کی مصنوعی سرحدات کو ختم کر کے ایک ایسا عالمی معاشرہ تشکیل فرمایا جس میں کالے اور گورے، عربی و عجمی اور آقا و غلام کا امتیاز ختم ہو گیا۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ ایک خاندان بن گئے اور مکہ کے ابوجہل و ابولہب دوسرا خاندان۔

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

عرب کے اس خونریز اور خون آشام خطہ میں جہاں برس ہا برس سے تلواریں لہو بہا رہی تھیں، آسمان نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ مکہ کے مہاجر اور مدینہ کے انصار گلے مل رہے ہیں۔ اور ان کے درمیان مساوات اور بھائی چارے کا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کے لیے اپنی زمینیں اور اپنے مکانات و باغات تک کی تقسیم عمل میں لا رہے ہیں اور جہاں ان کا پسینہ گرتا ہے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اہلِ ایمان کو اس انقلاب عظیم کی یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی

بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو بچالیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے تاکہ تم ہدایت یاب ہو سکو۔" (آل عمران)

عرب کے اس انقلاب عظیم کا راز اسلام کی ان لازوال تعلیمات میں نہاں ہے جن پر عمل کر کے اہلِ ایمان کے دل ایک دوسرے کی محبت سے لبریز ہو گئے۔ اسلام نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت، رنگ و نسل، وطن اور خون کی قرابت کے نتیجے میں استوار نہیں ہوتا ہے۔ اس کا باعث فقط کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں وہ اپنے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں وہ پرائے اور غیر ہیں۔

انسان کامل

انسانِ کامل، محسنِ انسانیت حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اسلام کا پیغام عام کیا تو آپؐ نے جس بات کو دلیل بنایا وہ یہ تھی کہ:

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہٗ افلا تعقلونؕ

اے میری قوم کے لوگو! میں تم میں اس سے پہلے ایک بڑی لمبی مدت گزار چکا ہوں کیا تمھیں عقل نہیں آتی۔

مطلب آپ کے فرمانے کا یہ تھا کہ میں تمھارے درمیان کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہوں، تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میری چالیس سالہ زندگی تمھارے سامنے ہے۔ تم مجھے صادق اور امین کہہ کر یاد کرتے ہو۔ میرے شب و روز تمھارے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہیں۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی سے جھوٹ نہیں بولا۔ غریبوں کی مدد کی۔ یتیموں کے سروں پر دستِ شفقت رکھا۔ محتاجوں کی دستگیری کی۔ جب تم سب

تسلیم کرتے ہو کہ میری زندگی میں کوئی عیب نہیں، کوئی خطا نہیں، کوئی دغا نہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چالیس سال اس طرح گزارنے کے بعد میں یک لخت بدل جاؤں اور غلط بات کہہ کر تمھیں مبتلائے فریب کروں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب آپ نے اہلِ مکہ کے سامنے یہ دلیل پیش کی تو وہ سب لاجواب ہو گئے۔ ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ آپ کی زندگی کے کسی گوشے پر انگلی اُٹھائے اور یہ لوگ انگلی اٹھاتے بھی کیسے۔ اس انسانِ کامل کی عظمتِ کردار کا عالم یہ تھا کہ چاند میں داغ دھبے ہو سکتے ہیں، برگِ گُل پر گرنے والی شبنم میں کثافت ہو سکتی ہے لیکن اس کے قول و عمل میں حرف گیری کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ جو صاحبانِ فکر و نظر تھے جن کے دلوں پر تالے نہیں پڑ چکے تھے، جن کی عقلیں زنگ سے محفوظ تھیں۔ وہ آئے اور آپ کے کردار کی عظمت دیکھ دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے چلے گئے۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس رُوئے روشن پر نظر ڈالی اور بے اختیار پکار اُٹھے کہ خُدا کی قسم! یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا۔

اور یہ تو وہ تھے جو ماننے والے تھے۔ ماننے کے ارادے سے آئے تھے۔ جو دشمن تھے، اور دشمن بھی ایسے کہ خون کے پیاسے، خود ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ابوسفیان، قیصرِ روم کے دربار میں پہنچا اس مشن پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس کی امداد حاصل کرے۔ بادشاہ نے بھرے دربار میں دریافت کیا" اے سردارِ قریش! جس کے خلاف مدد لینے آئے ہو، اور جس نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے، اس پر ایمان لانے

کے بعد کبھی کسی نے اس کا ساتھ بھی چھوڑا ہے؟" ابوسفیان نے جواب دیا "نہیں"۔ پھر پوچھا "کیا کبھی اس نے جھوٹ بھی بولا ہے؟" اور جب یہ سوال پوچھا جا رہا تھا تو ابوسفیان اس کی نزاکت کو خوب سمجھتا تھا۔ اسے خبر تھی کہ اگر میں نے اثبات میں جواب دیا تو میرا مشن ناکام ہو سکتا ہے۔ مگر وہ یہ جسارت کیسے کرتا کہ روزِ روشن کو شبِ تار کہتا۔ اس کے ہم وطن دربار میں موجود تھے۔ وہ اس کا جھوٹ پکڑ لیتے۔ ابوسفیان کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس پر قیصر روم نے عجب بات کہی۔ اس نے کہا "تو ابوسفیان سنو! جس نے کبھی بندوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولا۔ وہ خدا کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

یہ تھی وہ عظمتِ کردار کہ بالآخر دشمن بھی جس کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ مخالفتوں کے طوفان اٹھے لیکن جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ آندھیاں آئیں لیکن نسیمِ سحری میں تبدیل ہو گئیں۔ کانٹوں نے سر اٹھایا لیکن پھول بن کر خوشبو دینے لگے۔ پورا عرب زیرِ نگیں ہو گیا اور وہ جو کل تک دشمنِ جاں تھے وہی آپ کے پسینے پر خون گرانے کے لیے تیار ہو گئے۔

خُلقِ حسنہ

حضرت انسؓ حضور پُر نُور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے خادم خاص تھے اور بچپن ہی سے آپ کی خدمت کا شرف پا لیا تھا۔ انھوں نے اپنا ایک دلچسپ قصّہ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مجھے کام کے لیے بھیجا۔ یہ میرے بچپن کے دن تھے۔ راستے میں لڑکے کھیل رہے تھے۔ مَیں وہاں کھڑا ہو کر ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ اتنے میں حضور نبی اکرمؐ تشریف لے آئے اور پیچھے سے میری گردن پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو آپؐ کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ پھر بڑے پیار اور محبّت سے فرمانے لگے "اے انس! مَیں نے تجھے جس کام کے لیے کہا تھا اسے کر کے آ" مَیں نے عرض کی "بہت اچھا" یہ واقعہ بیان کرتے کے بعد حضرت انسؓ نے فرمایا مَیں نے نو برس تک حضورؐ کی خدمت کی ہے۔ اس ساری مدّت میں مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی آپؐ نے میرے کسی کام کرنے پر یہ فرمایا

ہو کر یہ کیوں کیا ہے یا کسی کام کے نہ کرنے پر مجھ سے دریافت کیا ہو کر یہ کیوں نہیں کیا۔"

یہی حضرت انسؓ ایک دوسری روایت میں ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔ فرمایا "ایک دفعہ ایک غریب بڑھیا نے راہ چلتے حضورؐ کا راستہ روک لیا اور کہنے لگی مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اے ماں! گلی کے جس کنارے پر بیٹھ کر بات کرنی چاہو وہاں بیٹھ جاؤ، چنانچہ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ آپ بھی اس کے پاس بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ جو کچھ اس کو آپ سے کہنا تھا وہ کہہ چکی تب آپ وہاں سے رخصت ہوئے۔"

اس میں شک نہیں کہ آنحضرتؐ کا اپنے خدام کے ساتھ اس طرح گھلا ملا رہنا اس وجہ سے تھا کہ ہر شخص بے تکلفی کے ساتھ آپ سے گفتگو کر سکے، اور کسی روک ٹوک کے بغیر جس معاملہ کے متعلق چاہے سوال کرے۔ آپؐ چونکہ مکمل شریعت لے کر آئے تھے اس لیے ضروری تھا کہ ہر شخص کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ جو چاہے دریافت کرے۔ جو شک اور شبہ اس کے دل میں پیدا ہو اسے دُور کرے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ لوگوں سے آپ کا ایک بے تکلف دوست کی حیثیت سے ملنا ہم کو اس حقیقت کا بھی درس دیتا ہے کہ انسان خواہ کتنے بھی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے اسے کبھی مغرور و متکبر نہیں ہونا چاہیے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین و دُنیا کے شہنشاہ ہیں۔ اور آپ کی حکومت کا سکہ نہ صرف اجسام پر بلکہ انسانوں کے قلوب و اذہان پر

اوران کے ارواح و نفوس پر ثبت ہے۔ مگر آپ کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب آپ اپنے کفش برداروں میں تشریف فرما ہوتے، تو صحابہ کرام کا کہنا ہے کہ حاکم و محکوم کا حجاب بالکل اُٹھ جاتا اور دیکھنے والا یہ اندازہ ہی نہ کر سکتا کہ آقا کون ہے اور غلام کون، خادم کون اور مخدوم کون، تابع کون اور متبوع کون؟

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ایک غیر متمدن زمانے میں انسانِ کامل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنی سادہ اور بے تکلف زندگی سے انسانی یگانگت اور مساوات کی جو اعلیٰ ترین مثال قائم کی ہے۔ دُنیا کی کوئی سوسائٹی اور کوئی قوم اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ یہ صرف آپ کی خصوصیت ہے کہ محبوبِ خُدا اور سَرورِ دوجہاں ہونے کے باوجود کبھی عجز و نیاز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میرا اپنا ایک شعر ہے۔

فرازِ عرش میسّر زمین سر بسجود
وہ کس مقام پہ آئے ہیں کس مقام کے ساتھ

رحمتِ عالم

خاتم النبیین، سیّد المرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ معاشرت کیا تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ آپ کس طرح معاملہ فرماتے تھے۔ سیرتِ نبوی کا یہ باب ہمارے لیے اخوّت، محبّت اور مساواتِ اسلامی کا ایک عجیب پیغام اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں بہترین اور جامع حدیث تو وہ ہے جو ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت خارجہؓ بن زید سے مروی ہے کہ :

ایک جماعت زید بن ثابت کے پاس آئی اور ان سے درخواست کی کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کچھ باتیں کرو۔ حضرت زید نے اس موقع پر جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ ہر مسلمان کو ازبر ہونی چاہئیں۔ انھوں نے فرمایا :

"میں تم سے کیا کہوں، میں آپؐ کا پڑوسی تھا جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی

تو مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ ہم جب دُنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ دُنیا کا ذکر کرتے، جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرماتے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے کا ذکر فرماتے۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں ایک بارعب حاکم اور صاحبِ جلال فرمانروا تھے، وہاں آپ نہایت ملنسار، حد درجہ نرم خُو اور اہلِ ایمان کے لیے بالکل ایک بے تکلف دوست تھے۔ رعب کا یہ عالم تھا کہ پہلی مرتبہ جب کوئی شخص آپ کو دیکھتا تو ڈر سے کانپ اٹھتا اور اتنی ہمت نہ ہوتی کہ آپ سے بات کر سکے۔ مگر ساتھ ہی آنحضورؐ کی تواضع، نرمیٔ خُو اور ملنساری کی کیفیت یہ تھی کہ جہاں آپ نے کسی سے بات کی وہ آپ سے اتنا بے تکلف ہو جاتا جتنا کہ اپنے ایک پُرانے دوست سے ہو سکتا تھا۔ وہ سَرورِ کونینؐ وہ آقائے دوجہاں جن کے دَم قدم سے اس تمام گلشنِ عالم کی بہار ہے اور تنہا باعثِ تخلیق کُل کائنات ہیں، ایک وقت میں اپنی عدالت میں تشریف فرما ہو کر لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کے درمیان بے لاگ انصاف فرماتے ہیں تو دوسرے وقت اپنے خادموں، اپنے ان غلاموں کیساتھ جو آپؐ کے پسینہ کی ایک بوند کی جگہ اپنے جسم کا آخری قطرۂ خون تک گرانے سے دریغ نہیں کرتے اور جن کے لیے حضورؐ کا ایک گوشہ چشم التفات، دُنیا و آخرت دونوں جہاں کی ابدی و سرمدی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کا تنہا کفیل و ضامن ہے، اس طرح گھُلے مِلے ہُوئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے بڑھ کر ان کا کوئی بے تکلف دوست اور آپ سے زیادہ ان کا کوئی محرم راز نہیں ہے۔ چہرۂ مبارک سے رعب

اتنا برستا ہے کہ بڑے بڑے شمشیر آزما سپاہی اور بڑے بڑے تیغ زن بہادر صرف آپؐ کو دیکھ کر اپنی تلواریں نیچی کر لیتے ہیں، لیکن شانِ تواضع یہ ہے کہ ایک بدو آتا ہے اور بے تکلف آپ کی گردن میں چادر کو لپیٹ کر اس قدر کستا ہے کہ حضورؐ کا چہرہ دورانِ خون کے رُکنے سے سُرخ ہو جاتا ہے اور آنکھیں باہر نکل آتی ہیں۔ اور مطالبہ کرتا ہے "محمدؐ میرے ان اونٹوں کو غلّہ کی بوریوں سے لاد دو۔" یہ کیسا بھونڈا انداز تھا مانگنے کا، مگر رحمتِ دوعالمؐ کی شان رحیمی و کریمی کے قربان کہ آپ کی جبینِ حلم و عفو پر ایک شکن نہیں پڑتی۔ اور حضورؐ بدو کے اونٹوں پر بیت المال سے غلہ لدوا دیتے ہیں۔

حضرت خارجہؓ بن زید کی یہ حدیث اس طرزِ معاشرت کا آئینہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم عام طور پر اپنے خدام کے ساتھ برتتے تھے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب لوگوں میں بیٹھتے تھے تو ہر شخص سے اس کی دلچسپی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کی تمام باتوں میں خواہ وہ دین سے متعلّق ہوں یا دُنیا سے، کھانے پینے کی ہوں یا جنّت و دوزخ کی برابر کی شرکت فرماتے تھے۔ اپنے خدّام کے ساتھ حضور کی بے تکلفی کا جو انداز تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر چند کہ اہلِ ایمان کے لیے آپ کی غلامی باعثِ صد عزّ و ناز تھی کہ بقول شاعر:

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی

مگر آپ نے ان جاں نثارانِ رسالت کو کبھی خادم یا غلام نہیں کہا، ہمیشہ "صحابی" فرمایا جس کا مطلب صحبت یافتہ اور ہم نشین ساتھی کے ہیں۔

حقوقِ انسانی کا اوّلین عالمی منشور

حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے انسانی جان کی حرمت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے مسلسل و متواتر کوشش فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ آخری حج کے موقع پر جب کہ آپ کو اپنے رب کی طرف سے یہ اشارہ ہو چکا تھا کہ اب آپ اگلے حج کے موقع پر اس دُنیا میں نہ ہوں گے۔ آپ نے آخری بار اپنی اس تعلیم کا اعادہ کیا اور ثابت کر دیا کہ اپنے رب کے حضور جاتے ہُوئے عُمر کے آخری لمحوں میں بھی آپ کو یہی فکر دامن گیر تھی کہ کہیں میرے بعد انسانیت امن و سکون سے محروم نہ ہو جائے۔

حجۃ الوداع کا یہ خطبہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بلا شبہ حقوقِ انسانی کا عالمی منشور ہے اور اس پہلے ہیومن چارٹر کے ان الفاظ میں عالمی امن کے سلسلہ میں زمانہ آج تک کوئی اضافہ نہیں کر سکا کہ:

"اے افرادِ نسلِ انسانی! تمھارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی عظمت و عزت ایسی ہی ہے جیسی تمھارے اس دن کی اور اس ماہ مبارک ذوالحج کی، خاص کر اس شہر میں ہے۔"

ہوسکتا ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ تعلیمات وہدایات تو صرف اہل ایمان سے تعلق رکھتی ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ یہ گمان صحیح نہیں۔ اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کے حقوق کا بھی ویسا ہی تحفظ کرتی ہے جیسا کہ اپنی مسلمان رعایا کا۔ اس کے نزدیک جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔

اللہ اور رسولؐ نے اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق کی ادائیگی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس لیے انھیں "ذمی" کہا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جن سے خدا اور رسولؐ نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ ان کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کرے گا جس سے معاہدہ ہے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔"

حضرت امام ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ غیر مسلم ذمی کو قتل کرنے والا مسلمان قتل کیا جائے گا کیونکہ انسان کی جان کی حرمت کے معاملے میں

اسلام مسلم اور غیر مسلم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔

اسلام کی اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا اور اس سلسلے میں عدل و انصاف کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ دُنیا کی کوئی دوسری قوم اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ خلفائے راشدینؓ کو اپنی ذمہ داری کا جو احساس تھا اس کا اندازہ حضرت عمر فاروقؓ کی اس وصیت سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے بعد میں آنے والے کے لیے قلم بند کرائی تھی۔ فرمایا :

"مَیں وصیت کرتا ہُوں کہ جن لوگوں سے اللہ اور رسولؐ کا عہد ہے اسے پُورا کیا جائے۔ خواہ ان کی خاطر تلوار ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑے اور یہ کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔"

تجھی پہ ختم ہے رُوح الامیں کی نامہ بری

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کے اندر نبی آخرالزّمان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم تک ہر دَور اور ہر قوم میں اپنے نبی اور رسول بھیجے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے:

"ولکل قوم ھاد ـــــــ اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے"

یہی سبب ہے کہ ہمارے بعض علماءِ کرام نے ان مشاہیر کو بھی جنھیں غیر مسلم عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور انھیں مصلح مانتے ہیں، نبی شمار کیا ہے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ جن کے ماننے والے آج بھی دُنیا میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک بہت بڑے عالمِ دین کی رائے میں وہی پیغمبر ہیں جنھیں قرآن نے "ذوالکفل" کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گوتم بُدھ کپل وستو کے رہنے والے تھے۔ عربی میں اسی 'کپل' کو 'کفل' بنا کر

کپل والے نبی کو "ذوالکفل" کا نام دیا گیا ہے۔ رہے ان کے نظریات و عقائد تو ان کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنے پیغمبروں کی تعلیمات کو مسخ کیا اور اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کی، اسی طرح گوتم بدھ کے پیرو کاروں نے بھی اپنے اصلی مذہب کی شکل بگاڑ کر رکھ دی۔

یہی نہیں بعض علمائے نے اس بات کو بھی قرینِ قیاس قرار دیا ہے کہ ہندو جن دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں یہ اصل میں وہ انبیاء اور پیغمبر ہیں جنھیں اس زمانے میں مبعوث کیا گیا تھا جب کہ زمین پر انسانوں سے پہلے جن آباد تھے۔ صاحب تفسیر مظہری مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کہتے ہیں کہ ان دیوتاؤں کی ہیبت ناک شکلیں، قد کاٹھ کئی کئی سر پاؤں اور ہاتھ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بزرگ جنھیں آج پُوجا جا رہا ہے انسان نہ تھے جن تھے۔ انھیں جنوں کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔ ہندوستانیوں نے ان کے بُت بنا کر انہی کی پُوجا شروع کر دی۔ یہ بات کہ جنوں میں بھی پیغمبر بھیجے گئے یا نہیں ایک الگ بحث ہے۔ یہ نظریات غلط ہوں یا صحیح، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے علمأ کے خیالات میں بعثت انبیاء کے متعلق کہاں تک وسعت پائی جاتی ہے۔

ہاں تو یہ بات مسلّماتِ دین میں سے ہے کہ ہر دَور اور ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی بھیجا گیا۔ مگر یہ سب نبی ایک خاص خطۂ زمین، ایک خاص زمانے اور قوم کے لیے تھے۔ ان میں سے کسی کی شریعت عالمگیر نہ تھی۔ ان میں سے

کسی کا پیغام سارے زمانوں کے لیے نہ تھا۔ اسی لیے کہ اللہ تعالیٰ جسے آخری نبی اور رسُول بنا کر بھیج رہا تھا یہ خصوصیت صرف اُسی کی نبوت اور شریعت کے لیے تھی کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے مبعوث ہو رہا تھا اور اس کا لایا ہُوا نظام قیامت تک کے لیے مسائل حیات کا حل لے کر آرہا تھا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو رسالت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ کیونکہ ان کے بعد زمانے کو کسی نبی اور شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی ؎

بصد یقین و بصد اعتبارِ دیدہ وری
تجھی پہ ختم ہے رُوح الامیں کی نامہ بری

اور رُوح الامیں کی نامہ بری کا یہ سلسلہ اس لیے اختتام کو پہنچا کہ حضورؐ اپنے ساتھ جو دستور خُدا کی طرف سے اس دُنیا کے لیے لائے تھے اس میں دُنیا کی ساری مشکلات، مصائب اور دوسرے آزاروں کا علاج موجود تھا۔ اور حضورؐ نے یہ سارے علاج اپنے عمل سے خوب آزمائے تھے۔ تبھی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قسم کھا کر کہا تھا "حضورؐ قرآنِ ناطق ہیں"۔ یعنی حضورؐ کا ہر عمل، ہر فعل اور ہر کام قرآنی احکام کے تابع ہے۔ حضورؐ نے قرآن حکیم کے اتباع میں جو کام کیے اسے علمائے حدیث نے سُنّت کا نام دیا ہے اور قرآن ہی کی طرح سنّت کی پابندی بھی ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دی ہے۔

یوں اس بات کی اجازت مسلمانوں کو میسّر رہی ہے کہ اگر بعض ہنگامی مسائل کے حل قرآن و سنّت میں نہ ملیں تو وہ اپنی رائے استعمال میں لائیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے پُوچھا۔

"جب تمھارے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو گا تو کیا کرو گے؟"

اُنھوں نے جواب دیا۔ "میں قرآن سے رہنمائی حاصل کروں گا۔"

آپ نے پھر پُوچھا۔ "اگر قرآن میں اس کا حل نہ ملا۔"

عرض کیا۔ "آپ کی سُنّت کی پیروی کروں گا۔"

فرمایا۔ "اگر اس میں بھی اس کا حل نہ ملا۔"

عرض کیا۔ "پھر میں اجتہاد کروں گا۔ قرآن وسُنّت کی روشنی میں انتہائی کوشش کر کے رائے قائم کروں گا۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ مسلمان کو اوّل تو کتاب وسُنّت سے ہر معاملہ میں صراحت کے ساتھ راہنمائی ملے گی لیکن اگر ایسا نہ ہو تو جب کبھی کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو اور نئی اُلجھن سامنے آئے اس وقت کے علمائے اُمّت کا فرض ہے کہ وہ کتاب وسُنّت کی روشنی میں اسے حل کریں۔ اصطلاحِ شریعت میں اس عمل نے تفقُّہ فِی الدّین کا عنوان پایا ہے اور فقہ اسلامی کی بُنیاد اسی تفقہ فی الدین پر رکھی گئی ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ کی عسکری قیادت

سیرت نگاروں نے عہدِ رسالت میں ہونے والے معرکوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ جن میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ہے ، یہ "غزوات" کہلاتے ہیں۔ اور وہ جن میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے لشکر روانہ کیے ہیں یہ "سرایہ" کہلاتے ہیں۔ سرایہ کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ سیرت پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ کی دس سالہ زندگی میں خود آپؐ کو کفر کے مقابلے میں تقریباً تیئس مرتبہ تیار ہو کے نکلنا پڑا ہے۔ اس طرح ہر چار مہینہ میں ایک مرتبہ آپ نے جہاد کے لیے کمر باندھی ہے اور ظاہر ہے باقی تین مہینے تو اس جہاد کی تیاری ہی میں بسر ہوئے ہوں گے۔ گویا ہجرت کے بعد آپ کی پاک اور مبارک زندگی کے دس کے دس سال جنگوں میں بسر ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہی ہنگامی حالات میں آپ نے مدینہ منوّرہ کے اندر نمونہ کی اسلامی ریاست بھی قائم فرمائی۔ ایک بہترین معاشرہ بھی

ترتیب دیا اور افراد کو بداخلاقی کی پستیوں سے اُٹھا کر اخلاق کی سربفلک رفعتیں بھی عطا فرمائیں۔

عصرِ حاضر کے بعض مشہور و معروف جرنیلوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ سپاہیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کو بہترین عسکری قیادت کی پہچان بتاتے ہیں۔ امریکہ کے جنرل واشنگٹن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک دن عام لباس میں کہیں جا رہا تھا کہ اس نے رستہ میں چند سپاہیوں کو دیکھا جو ایک بہت بڑے شہتیر کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قریب ہی فوج کا افسر کھڑا تھا جو انھیں برابر حکم دینے میں مشغول تھا۔ واشنگٹن نے گھوڑے سے اُتر کر افسر سے کہا آپ بھی کیوں اس میں شامل نہیں ہو جاتے؟ افسر نے جواب دیا کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ان کا افسر ہوں؟ اس پر واشنگٹن گھوڑے سے اُتر کر سپاہیوں کے ساتھ مل کر زور آزمائی کرنے لگا۔ شہتیر اُٹھا لیا گیا تو اس نے افسر صاحب سے کہا "آئندہ جب بھی آپ کو محنت کے کام میں کسی آدمی کی ضرورت پڑے تو مجھے یاد فرما لیا کیجیے۔ میں آپ کا سپہ سالار واشنگٹن ہوں"۔

کوئی شبہ نہیں یہ واقعہ اپنی جگہ عظیم الشان ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کے جرنیلوں نے یہ سبق کہاں سے حاصل کیا۔ دُنیا کا وہ کون سا قائد تھا جس نے اپنے بعد آنے والے فوجی قائدین کو عسکری قیادت کا یہ سنہری اصول عطا کیا تھا۔ آؤ! تاریخ سے دریافت کریں وہ بتائے گی کہ اس سپہ سالار اعظم کا نام نامی اسم گرامی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ غزوہ خندق میں آپؐ نے پیٹ پر پتھر باندھ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ خندقیں کھودی

ہیں۔ جب کبھی لشکر نے کوچ کرنے کے بعد کہیں پڑاؤ کیا ہے اور کھانا پکانے کی تیاریاں کی ہیں آپ لکڑیاں چُن چُن کر لاتے رہے ہیں۔ لوگوں نے آپؐ سے درخواست کی آپ یہ زحمت نہ فرمائیں۔ مگر آپ کا جواب یہی تھا کہ مَیں اپنے حصّے کا کام کیوں نہ کروں۔

جنگ، حضور سَرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دُنیا میں تشریف آوری سے قبل وحشت و بربریّت کا ایک بھیانک ڈرامہ تھی اور بس، نہ اس کے لیے کچھ حدود تھیں نہ اخلاقی ضابطے مگر آپ نے مظلوموں کے دفاع کے لیے اس میدان میں قدم رکھا تو جنگ کو بھی عبادت بنا دیا۔ حکم دیا کہ عورتوں بچّوں اور بوڑھوں، بیماروں اور گوشہ نشینوں پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ حکم دیا کہ صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ حکم دیا کہ دوسرا فریق صلح کرنا چاہے تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ، بار بار وضاحت فرمائی کہ جنگ کا مقصد سمجھ لو، یہ نہ مالِ غنیمت کے لیے ہے نہ کشور کشائی کے لیے۔ یہ تو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق صرف اس لیے ہے کہ:

"اگر اللہ تعالیٰ ایک کے ذریعے سے دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو ان راہبوں کے خلوت کدے، یہود و نصاریٰ کے عبادت گھر، مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دیے جاتے۔"

موجودہ ملٹری سائنس کی رُو سے ایک بہترین سپہ سالار کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وُہ اپنی فوج کو عمدہ تربیت دے۔ اس میں ڈسپلن اور اطاعت

کا جذبہ پیدا کرے اور سپاہیوں کے درمیان اخوت اور محبت پیدا کر کے انھیں ایک ٹیم بنا دے۔ جب ہم اس اصول کو سامنے رکھ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صحابہ کرام کو شاندار ٹریننگ دینے کی کوششوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک بہترین اخلاقی مُعلّم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں آپؐ کی بے نظیر عسکری قیادت کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ دُنیا کے بڑے سے بڑے جرنیل کو دیکھ لو اپنی زندگی میں پیش آنے والے معرکوں میں سے وہ کسی نہ کسی معرکہ میں ضرور شکست کھا گیا ہوگا۔ مگر اسلام کے سپہ سالار اعظم نے تقریباً تیس غزوات میں شرکت فرمائی۔ ہمیشہ فتح و نصرت نے آپؐ کے قدم چومے اور کہیں بھی آپؐ کو ہزیمت نہیں اٹھانی پڑی۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ آپؐ نے لشکرِ اسلام کو جو عظیم تربیت دی تھی۔ اس کے ہوتے ہُوئے شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حضورؐ طبِّ عربی کے بانی تھے

جس طرح بہت سے حقیقت پسند دانش وروں نے، اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی قرآن حکیم کو جدید سائنس کی ایک بنیادی نظریاتی اساس قرار دیا ہے۔ بالکل اسی طرح میرے نزدیک طب جدید کی بنیاد حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے وہ حکیمانہ تصوّرات و مشاہدات ہیں جن سے دُنیا آج سے چودہ سو سال پہلے آشنا ہوئی تھی۔

یہ ستم ظریفی کی حد ہے کہ وہ طبّ عربی جس کے تمام تر سوتے سیّدِ کائنات مسیحائے جہاں صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاک قدموں تلے سے پھُوٹے تھے اس کا نام طب عربی کی بجائے طب یونانی مشہور ہُوا۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ بنو عبّاس کے عہد میں خصوصاً ابوجعفر منصور، مہدی ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دَورِ ہمایونی میں بہت سے حکمائے یونان کی طبی تالیفات عربی زبان میں ترجمہ ہوئی تھیں اور

یونان کے سقراط، ارسطو، جالینوس اور اس پایہ کے دوسرے حکمائے یونان کی جغرافیائی حدود سے نکال کر نہ صرف عرب اور ملحقات عرب میں بلکہ پوری اسلامی مملکت میں داخل کر لیے گئے تھے۔ اس کے باوجود تاریخ اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا دعویٰ ہے کہ یہ طب عربی جس نے حکمائے یونان کے تصوّرات، نظریات اور معالجات سے عہد بنی عبّاس میں بڑا اثر قبول کیا تھا اپنے مزاج، اپنی فطرت اور اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف عربی تھی مکی بھی تھی اور مدنی بھی تھی۔ حجازی بھی تھی اور یمنی بھی۔ بلکہ مَیں تو یہ کہنے میں بھی ذرا سی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہوں کہ یہ طب عربی ان آخری گھڑیوں تک طب عربی ہی تھی۔ جب قرطبہ اور غرناطہ سے اسے جلا وطنی کی سزا ملی تھی اور اسے اطالیہ اور پھر دوسرے مغربی ممالک کی سمت ہجرت پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

بلاشبہ اس ہجرت کے وقت وہ ایک زوال چشیدہ تمدن کی لٹی ہوئی پونجی کے طور پر مغربی دانش کدوں میں پہنچی تھی، مگر اس کے سارے فطری اوصاف موجود تھے۔ وہ ہر لحظ اور ہر اعتبار سے طب العرب تھی۔ اندلس کی ہواؤں، اندلس کے دریاؤں پہاڑوں اور ندی نالوں نے اس کے طبعی مزاج میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا کہ اندلس کے آباد کار مسلمان بادشاہ اور مُسلمان عوام جب اندلس کو اپنا وطن بنا کر اس میں بس گئے تھے تو وہ اپنے سارے قومی اوصاف کو ہمراہ لے کر وہاں پہنچے تھے، حتیٰ کہ وہ قومی جغرافیائی علامت کے طور پر کھجور کے درخت تک وہاں لے گئے تھے اور کوئی عرب بستی

اندلس کی ایسی نہ تھی جہاں کھجور کے درختوں کے سائے دن اور شام کے وقت گھٹتے بڑھتے نظر نہ آتے۔

یقیناً مَیں اتنا تنگ دل نہیں ہُوں کہ یُونانی حکمأ کے ان وسیع اثرات سے انکار کروں جو یونانی کتابوں کے طوفانی تراجم کے سبب طب عربی اور عرب طبیبوں کے ذہنوں پر بنو عباس اور اندلس میں اسلامی عروج کے دَور میں مرتّب ہُوئے تھے۔

مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے بعض درباری طبیب یونانی طریقِ علاج میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے یونانی اطبا کے تجربات و مشاہدات کو اپنے طریق علاج میں پُوری طرح سمو لیا تھا اور طبّ العرب کے دامن میں بے پناہ وسعتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ مگر طب اور ادویہ سازی سے عرب علمأ کا اصل لگاؤ یونان کے تتبع میں نہیں، حضور سرورِ کون و مکانؐ کی اس دل چسپی اور توجہ کا حاصل تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو انسانی جسم کو صحت مند رکھنے سے تھی۔

حضورؐ نے اپنی مدنی زندگی میں یقیناً آج کے ترقی یافتہ طبی دَور کی طرح باقاعدہ ہسپتال یا دارالعلاج قائم نہیں کیے تھے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا کے پہلے وہ نبی اور وہ مصلح ہیں جن کی نظر کیمیا اثر محض دِلوں کی اصلاح پر مرکوز نہ تھی۔ حضورؐ انسانی صحت کو برقرار رکھنے کو بھی اچھے معاشرہ کی تخلیق میں بنیادی امر قرار دیتے تھے۔

حضور کے سوانح نگاروں اور تمام بڑے محدثین نے حضورؐ کے ذاتی

اوصاف وحسنات کا شمار کرتے وقت اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے کہ حضورؐ نہ صرف خود ہر وقت پاک صاف رہتے، ماحول کو بھی ہر طرح کی گندگی، غلاظت اور ان اشیاء سے ہمہ تن پاک صاف رکھتے جو انسانی صحت کو بگاڑنے کا موجب بنتی ہیں۔ حضور گلی سڑی، متعفن غذا کے استعمال سے خود بھی رُکتے اور ساتھیوں کو بھی روکتے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوراک بے حد سادہ ہوتی۔ خشک روٹی یا کھجوریں عموماً دوپہر و رات کے دسترخوان پر سجتیں۔ مگر یہ دسترخوان بھی صاف و شفاف ہوتا اور وہ جگہ صاف ہوتی جس پر یہ دسترخوان بچھتا۔

ابن سعد اور محدث ترمذی نے حضورؐ کے شمائل میں اس وصف کو بنیادی صفت ٹھہرایا ہے کہ حضورؐ کے حجروں کے فرش اس درجہ صاف ہوتے کہ کہیں کوئی تنکا تک پڑا دکھائی نہ دیتا۔ اور وہ صحن جو حضورؐ کے حجروں اور مسجد نبویؐ میں حائل تھا، اس قدر پاکیزہ تھا کہ وہاں صحابہ کچھ بچھائے بغیر سونے میں ہزار ہزار لطف محسوس کرتے تھے۔

حضورؐ کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا تھا۔ مگر اتنا ستھرا ہوتا کہ اسے جائے نماز کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا اور بعض صحابہ تو قسمیں کھا کھا کر بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ جدھر سے گزرتے فضا خوشبو سے بھر جاتی تھی۔

حالانکہ پانی کی مدینہ میں خاصی قلت تھی، مگر حضور انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے اس بنیادی عنصر کی پاکیزگی کو ایمان کی سی پاکیزگی کی حیثیت دیتے تھے کہ حضورؐ جانتے تھے کہ خوراک کے بعد پانی کی پاکیزگی

صحت انسانی کے لیے حد درجہ ناگزیر ہے۔

ایسی کئی حدیثیں مختلف محدثین نے اخراج کی ہیں جو یہ شہادت مہیا کرتی ہیں کہ حضور نے پانی کے ذخیروں کی حفاظت کو ایک مذہبی فریضہ بنا دیا تھا اور ساتھیوں پر یہ پابندی بڑی سختی سے عائد کی تھی کہ پانی کے ذخیروں کو گندا نہ ہونے دیں۔ ان میں کسی قسم کی غلاظت نہ پڑنے دیں تاکہ بیماری کے سارے امکانات ختم ہو جائیں۔

خوراک صاف ستھری اور سادہ ہو۔ پیٹ بُری طرح بھرنے نہ پائیں۔ اور پانی پاکیزہ، پینے اور دوسرے استعمال کے لیے ہر خاص و عام کو میسّر آئے تو بیماریاں بہت کم جنم لیتی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی اسلامی معاشرہ کی عمومی صحت بہت اچھی تھی۔ لوگ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور اگر کبھی بیمار ہوتے تو حضورؐ ان کے علاج پر بہت توجّہ فرماتے۔ نہ صرف خود ان کی تیمارداری اور معالجہ کی خاطر مشاورت کے لیے ان کے پاس پہنچتے، طبیبوں اور جرّاحوں کو بھی انؓ کے پاس بھیجتے۔

مورخین نے گو نبوی دَور کے طبیبوں کے اسمائے گرامی سے آنے والی نسلوں کو آگاہ نہیں کیا ہے، تاہم اس بات کی پُوری وضاحت پیش کی ہے کہ حضورؐ نے متعدّد بار خود بھی اپنا علاج طبیبوں اور جرّاحوں سے کروایا اور جماعت کے لیے بھی اس گروہ کی خدمات مستعار لیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئیں،

ان سب کے وقوع کے وقت طبیبوں اور جراحوں کا پورا گروہ حضورؐ کے ساتھ ہوتا جو زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج معالجے کا کام کرتا تھا۔

جنگِ اُحد میں مورخ ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن جریر، طبری اور ابن کثیر نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے حضورؐ کے دہن مبارک اور چہرہ معلیٰ کی مرہم پٹی کا خصوصی ذکر کیا ہے اور یہ تفصیل بیان کی ہے کہ حضورؐ کو یہ زخم کس طرح آئے تھے اور حضورؐ کا دفاع جن عشاق نے اپنے جسموں سے کیا ان میں سے کئی تو شہادت پا گئے تھے۔ تین جانباز زندہ رہے تھے۔ مگر سخت زخمی تھے۔ ان میں سے جناب ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جسم تو دشمن کی تیر اندازی سے بُری طرح چھد گئے تھے۔

(ابن اسحاق وابن ہشام۔ جز ۲۔ ص ۱۲۵

ابن کثیر۔ جز ۴۔ ص ۲۲

طبری۔ جز ۲۔ ص ۵۸)

جنگ اُحد میں زخمی ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی اور ان کی مرہم پٹی جن جراحوں نے کی تھی وہ بھی کئی تھے۔ جنگ اُحد کی تفصیل لکھتے وقت مورخین نے بعض مسلمان خواتین کے نام بھی شمار کیے ہیں جو میدانِ جنگ میں حاضر تھیں اور جنھوں نے "نرسنگ" کے فرائض انجام دیے تھے۔

(بخاری۔ جز ۳۔ ص ۲۱۵)

یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ حضور سرور کائناتؐ نے نہ صرف طب و

جراحت کو سرکاری حیثیت دی تھی، نرسنگ کے پیشے کو بھی ایک ملی ضرورت قرار دیا تھا۔ بلاشبہ یہ پیشہ اس وقت رضاکارانہ حیثیت رکھتا تھا اور خاصا محدود تھا۔ مگر اس وقت کی ضرورت کو بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ جیسے جیسے فوجی اور عوامی طبی ضرورتیں بڑھتی گئیں طبیبوں اور جراحوں کا عملہ بھی بڑھتا رہا۔

محدثین اور مورخین کے نزدیک حضورؐ کے وصال کے وقت اسلام کی باقاعدہ سپاہ تیس ہزار کے قریب تھی اور اس تیس ہزار کی طبی ضرورتوں اور جراحتوں کی مرہم پٹی کے لیے جو طبیب اور جراح مخصوص کیے گئے تھے وہ کافی تعداد میں تھے۔ (ابن کثیر۔ جزء ۵۔ ص ۳۱۱

الطبری۔ جزء ۳ ص ۲۲۲۔ ۲۲۵)

بلاشبہ ہم ان طبیبوں اور جراحوں کی تعداد گن نہیں سکتے مگر انھیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے وقت دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کئی بار حضورؐ کی فصد کھولی۔ انھوں نے حضورؐ کا علاج کیا۔ حضورؐ کو جب ایک بدبخت یہودیہ نے زہریلی خوراک کھلاوی تھی تو حضورؐ کا باقاعدہ علاج ہوا تھا اور جس معالج نے حضورؐ کا علاج کیا تھا وہ اسلامی معاشرہ کا ایک اہم جزو تھا۔

یوں یہ شکایت بجا ہے کہ علمائے حدیث و تاریخ نے اس سلسلہ میں جو تفصیل پیش کی ہے وہ نئے طبی دور کے طبی شعبوں سے ہم آہنگ نہیں ہے تاہم اس دور کا جو رنگ تھا وہ اس سے خوب جھلکتا ہے۔

مثلاً امام بخاری نے جو محدثین کے امام مانے گئے ہیں اپنی تالیف صحیح بخاری

کا ایک مستقل باب کتاب الطّب کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی طب سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ خصوصاً حضورؐ کے دَور کی "نرسنگ" سے متعلق ایک معزز خاتون جناب ربیع بنت معوذ کی یہ روایت بھی اخراج کی ہے۔

عن ربیع بنت معوذ بن عفرا قالت کنا نغزوا مع النبی صلّی اللہ علیہ وسلم نسقی القوم نخدمھم ونرد القتلی والجراحی الی المدینۃ۔

(بخاری۔ جزء ۲ ۔ ص ۲۱۵)

"ہم حضور نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتی تھیں۔ سپاہیوں کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت انجام دیتیں اور شہدأ اور زخمیوں کو اٹھا کر مدینہ واپس لاتیں۔"

ان ہی کی طرح حضرت فاطمہ سیّدۃ النسأ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ حضرت فاطمہؓ بھی زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت انجام دیتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔

امام بخاری نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت بعض ایسی روایتیں بھی درج کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور نے بعض مریضوں کا خود علاج تجویز کیا تھا۔ مثلاً ایک صحابی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کے بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔ حضورؐ نے حکم دیا اسے شہد کھلاؤ۔ یہ صحابی دوبارہ سہ بارہ حضورؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا شہد کھلا چکا ہوں مگر شفا نہیں

ہوئی۔ حضورؐ نے تیسری بار بھی انھیں شہد کھلانے کا حکم دیا۔ تیسری بار شہد کا استعمال موثر ثابت ہُوا اور بیماری جاتی رہی۔ (بخاری۔ جُز ۳۔ ص ۲۱۵)

امام بُخاری نے ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر کیا ہے جو غلط اور ناکافی خوراک کے استعمال سے بیمار ہو گیا تھا۔ حضورؐ نے اس پورے گروہ کا علاج خود کیا۔ انھیں صاف ستھری جگہ رہائش کے لیے مہیا کی۔ عمدہ خوراک کا بندوبست کیا۔ اور پھر ایک صحت افزا مقام پر ٹھہرانے کا اہتمام فرمایا۔ یہ پورے کا پورا گروہ حضورؐ کے اس عمل سے تندرست ہُوا۔

(بخاری۔ جُز ۳ ص ۲۱۶)

حضورؐ نے بعض ادویہ کے استعمال کی ہدایات بھی جاری فرمائی تھیں۔ مثلاً کلونجی (الحبۃ السوید ا) کے استعمال کو ضروری قرار دیا تھا اور تلبینہ قسم کے ایک مرکب (مکسچر) کو جو شہد دودھ اور چوکر کی باہمی آمیزش سے تیار ہوتا تھا۔ عوامی مفاد کے لیے خوب عام کیا تھا۔

اس وقت شاید یہ بات کچھ عجیب لگے لیکن حضورؐ کے دور کے عرب میں بعض بیماریوں کا علاج پچھنے لگوانا تھا اور اس طریق علاج کے ماہرین کی ایک خاص بڑی جماعت مدینہ اور مدینہ کے نواح میں موجود تھی اور باقاعدہ آج کل کے سرجنوں کی طرح اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کرتی تھی اور یہی اس کا پیشہ تھا۔

مثلاً جناب ابن عباس ایک ایسے ہی سرجن کے بارے میں کہتے ہیں حضورؐ نے پچھنے لگوائے اور باقاعدہ اُجرت عطا کی۔ الفاظ ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم احتجم و اعطی الحجام اجرہ۔ (بخاری۔جز ۳ - ص ۲۱۸)

ایک دوسری روایت بھی جناب ابن عباس ہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں حضورؐ ایک حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے۔ دوران حج میں حضورؐ کو آدھے سر میں درد لاحق ہُوا تو حضورؐ نے اس درد سے نجات پانے کی خاطر ایک سرجن سے سر مبارک میں پچھنے لگوائے۔

(بخاری جز ۳ ص ۲۱۹-۲۲۰)

امام بخاری نے ایک انصاریہ صحابیہ جناب ام قیس کا نام لیا ہے جن کے بیٹے کے گلے میں کوئی تکلیف ہوگئی تھی اور انھوں نے کسی اناڑی معالج سے اس کے گلے پر مالش کروائی تھی، مگر بیماری بڑھ گئی تھی۔ یہ خاتون گھبرا گئیں۔ بچے کو اٹھا کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حضورؐ نے حال سُن کر انھیں ڈانٹا اور "عود ہندی" کے استعمال کا حکم دیا۔

علام تدغون اولادکن بھذ الغلاق علیکن بھذا العود الھندی۔ (بخاری جز ۳ ص ۳۲۲)

مَیں نے یہ روایت یہ سمجھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے نہ صرف عرب میں مروج طریق علاج کو برتا بلکہ بعض ایسی مفید غیر مُلکی ادویات کا استعمال بھی ضروری سمجھا جو عوامی علاج کے لیے مفید تر تھیں۔ مثلاً یہی عود ہندی جو ہندوستان سے عرب میں درآمد ہوتی تھی۔

موضوع بہت لمبا ہے۔ مَیں نے جان بوجھ کر اختصار سے کام لیا ہے

اور صرف یہ سمجھانے پر اکتفا کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیماریوں کے علاج معالجے کو بہت اہمیت دیتے تھے ۔ خود بھی باقاعدہ علاج کرواتے اور کرتے اور معاشرہ کو صحیح طریقِ علاج استعمال کرنے کی ترغیب دیتے تھے ۔ اور حضورؐ کے اس مسلک نے اسلامی معاشرہ کو بہت فروغ دیا ۔ میرے نزدیک حضورؐ کا یہ مسلک ہی طب عربی کی اصل بنا و اساس ہے۔

مجھے ان علمأ سے شدید اختلاف ہے جن کا خیال یہ ہے کہ طبّ العرب کی تمام ترو سعتیں یونانی طبیبوں اور حکمأ کی تصانیف کے تراجم کا نتیجہ تھیں۔ میرے وجدان کی رُو سے یہ کلیہ درست نہیں ہے ۔ اگر یہ کلّیہ درست ہوتا تو یونانی حکمأ کے طریقِ علاج اور نظریات کے تعارف سے پہلے کے دَور کے اسلامی معاشرے میں بیماریاں عام ہوتیں۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے حضورؐ کے عہد مبارک کے مکّی دَور کو چھوڑ کر مدنی دَور سے لے کر عہد بنی عباس کے ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ تک کوئی دوسو سال کا عرصہ بنتا ہے۔ ان دو صدیوں میں صرف ایک متعدی بیماری کا ذکر کیا گیا ہے جس میں عوام الناس مبتلا ہُوئے تھے ۔ یہ بیماری عمواس سے شروع ہوئی تھی اور اس سے اسلامی معاشرہ کو گوخاصا نقصان پہنچا تھا مگر جب حضرت عمر فاروقؓ نے اس کا مناسب تدارک فرمالیا تو بنی عباس کے دَور تک کوئی ایسی وبا اسلامی معاشرہ میں رُونما نہیں ہو پائی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس دوسو سالہ دَور میں اسلامی حکومت نے عوام الناس کی صحت کی بحالی و نگہداشت پر پوری توجہ صرف کی تھی ۔ اور حضورؐ کے

طبی مسلک کو ہر لحاظ سے عملی جامہ پہنایا تھا۔

اس لیے میرا دعویٰ ہے کہ بنو امیہ، بنو عباس اور مابعد کی اسلامی حکومتوں کے عہد میں مغرب کی بیداری کے وقت تک، انسانی صحت کے بقا اور ادویہ سازی کے باب میں جتنی بھی ترقی ہوئی اس کا اصل طب نبوی اور مسلک نبوی کے سوا کوئی اور شے بالکل نہیں ہے۔

یہ طب عربی کے پہلے دَور کی بڑی شخصیتیں جابر بن حیان، ابراہیم جنداب محمد بن ابراہیم فرازی، جبریل، عبدالملک اصملی، حسین بن اسحاق، اصطرلابی اور لبعد کے دَور کے یعقوب کندی، عطارد، محمؐد موسیٰ خوارزمی، ثابت، جابر، حامد واسطی، محمؐد حجازی، عبداللہ ترکی، احمد بلخی، علی عمرانی، سنان سعید دمشقی، موفق ہروی، فارابی، یوسف خوارزمی، احمد طبری، ابوالوفا بوزجانی، فجندی، مجوسی، صفانی، قرطبی، مجریطی جلجل، ابن الوافد، الزرقالی، ابوالقاسم زہراوی، ابن یونس، تمیمی، بلادی، مردانی، موصل، ابن الہیثم، سجستانی، البیرونی، بوعلی سینا، کرخی، نسوی، عمرخیام، واسطی اسفرازی، بیہقی، خازن، علی بن عیسیٰ، ابوالحسن اور نصیر الدین محقق طوسی ایسے یگانۂ روزگار حکما و اطبأ اسلامی طبی افق کے آفتاب و ماہتاب بن کر محض اس لیے چمکے تھے کہ ان سب کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینوں میں صحت انسانی کو برقرار رکھنے کا صحیح جذبہ موجزن کیا تھا اور ایک ایسی لگن جستجو کی ان کے دلوں میں بھر دی تھی کہ انھوں نے طب وادویہ سازی میں نت نئے تجربات و مشاہدات کیے اور تحقیق کا دامن کچھ اس طرح پھیلایا

کہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق کوئی بیماری سچ مچ ایسی نہ رہی جس کی دوا انھوں نے ڈھونڈ نہ لی۔

میں نے جابر بن حیان کا نام سرفہرست رکھا ہے۔ یہ جابر بن حیان عرب کے جنوبی علاقے کے ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ازد کا چشم و چراغ تھا۔ یہ طب عربی ہی نہیں طب جدید کی عظیم عمارت کا بہت بڑا استون ہے۔ اس طبیب بے مثال اور حکیم عرب کا باپ حیان کوفہ میں دوا سازی کا کام کرتا تھا۔ وہ طبیب بھی تھا اور دوا ساز بھی۔ تاریخ نے حیان کے اساتذہ کے نام شمار نہیں کیے ہیں لیکن اس کے یہ اساتذہ قطعی طور پر عرب حکماء اور اطبا تھے۔ کیونکہ یہ شخص حیان جب کوفہ کے ایک بڑے دوا ساز کی حیثیت سے عوام الناس کو طبی سہولتیں بہم پہنچا رہا تھا تو طب یونانی کے شہرہ آفاق حکما کا سایہ طب عربی پر بالکل نہیں پڑا تھا۔ اور میں تو بجا طور پر سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک عرب طبیب یونانی حکماء سے متعارف تک نہ تھے۔ طب عربی اس وقت پورے طور پر خود کفیل تھی۔ اسے کسی بیرونی آمیزش ذہنی و عملی کی قطعاً حاجت نہ تھی۔

بلاشبہ اس بات سے اختلاف ممکن نہیں ہے کہ حیان کے بیٹے جابر نے جب طب و حکمت کے نئے نئے تجربے اور اہم انکشافات کیے اور کیمیا سازی کے ایک بالکل نئے انداز کی طرح ڈالی تو وہ یونانی حکما کے نظریات و تجربات کا پورا علم رکھتا تھا۔

اس کے باوجود یہ حقیقت بڑی وزنی حقیقت ہے کہ جابر کا پہلا

بڑا طبیب استاد حوبی الحمیاری نامی ایک خالصتاً عرب طبیب تھا۔ نظریاتی اعتبار سے بھی اور تجرباتی لحاظ سے بھی۔ جابر نے اس سے ہر وہ بات سیکھ لی جو ایک طبیب حاذق کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

مَیں پُورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جابر جب حوبی الحمیاری کے مکتب سے فیض یاب ہو کر عملی دُنیا میں داخل ہُوا تو وہ ایک مکمّل طبیب تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی علمی جستجو اسے یونانی حکما کے دربار میں بھی لے آئی۔ اس نے اپنی فکری تشنگی بجھانے کے لیے یونانی زبان سیکھی اور یونان کے خیالات و نظریات اور مشاہدات کو پہچانا اور جانا۔ اس کے باوجود ساری دُنیا کے حق پسند سائنس دانوں اور طبی علوم کے ماہرین نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ جابر اپنی ذات میں اُستادوں کا اُستاد اور فن و حکمت کی راہوں کو منوّر کرنے والا خورشید بے نیاز تھا۔ اس کا نور کسی کے پرتو کا محتاج نہ تھا۔ حکمائے یونان کے نظریات و تصورات سے اس کی نظر کو یقیناً وسعتیں میسّر آئی تھیں۔ یقیناً اس کے ذہنی افق لامحدود بن گئے تھے۔ لیکن اس کی شخصیت کسی بھی نوع اور کسی بھی عنوان سے ثانوی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

مَیں تو یہ تک کہنے پر قدرت رکھتا ہوں کہ جابر کیمیائی تجربات کرتے وقت کسی بھی یونانی حکیم کو اپنے پیش نظر نہیں رکھتا تھا۔ اس نے جو آلات استعمال کیے تھے وہ بھی اس کے اپنے ذہن رسا کی تخلیق تھے۔ وُہ ہمہ تن اپنا استاد خود تھا اور اس کی مشاہداتی قوّتیں پُوری طرح سے خود مختار

تھیں۔ اور یہ خود مختاری اس ذوق مسیحائی کی پیداوار تھی جو دربار نبوی کے فیض سے سکہ رائج الوقت بن گئی تھی۔

یہی عالم باقی کے ان نامور طبیبوں اور حکمائے عرب کا بھی تھا، جو جابر بن حیان کے ہم عصر تھے۔ وہ بھی یقیناً حکمائے یونان کے نظریات اور مشاہدات سے آشنا تھے۔ اس کے باوجود ان کی ذہنی صلاحیتیں اور مشاہداتی قوتیں نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینہ مبارک سے پھوٹنے والی نورانی کرنوں کا پرتو تھیں اور اس دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ تھیں جو حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحت عامہ کے تحفظ سے تھی۔ انھوں نے طب و حکمت کے چمن میں جو پھول کھلائے، صحت عامہ کو برقرار رکھنے کی جو جد وجہد کی اس کا اصل حضورؐ کا یہ بنیادی فرمان تھا:

ما انزل اللہ داء الا انزل لہ شفاءً۔

اللہ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی جس کی دوا کا اہتمام نہ فرمایا۔

(بخاری۔ جلد ۳ - ص ۲۱۴)

اور میرے نزدیک یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ بنو عباس کے نامور تاجداروں ابوجعفر منصور مہدی، ہارون الرشید اور مامون الرشید نے یونانی حکما کی تصانیف کے تراجم کا کام جس انہماک اور ذوق وشوق سے شروع کیا تھا یہ حضورؐ کے اسی فرمان کا نتیجہ تھا۔ ابوجعفر منصور۔ اس کا بیٹا مہدی، اس کا پوتا ہارون الرشید اور پڑپوتا مامون الرشید یونانی حکما کے مشاہدات و نظریات تراجم پر محض اس لیے متوجہ ہوئے تھے کہ ہر بیماری کی

شفا کے تمام ممکن راستے ان کو معلوم ہو جائیں۔ اور وہ تمام تر طریق علاج ان کی گرفت میں آجائیں جن کے ذریعے صحت عامہ ہر بیماری سے محفوظ ہو جائے۔ یقیناً یہ بات بھی ہر شبہ سے پاک ہے کہ یونانی حکما و اطبا کی کتابوں کے تراجم جب عام ہوئے تو ان کا اثر طب عربی پر خوب پڑا۔ اور طب عربی اور طب یونانی کی باہمی آمیزش خوب ہوئی تھی۔ مگر اس ہر بات کے باوجود طب عربی کا ذہن اور عرب طبیبوں کا اسلوب علاج، کلیتاً عرب ذہن اور عرب طریق علاج ہی رہا۔

تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ میں صرف ہارون الرشید کے طبیب خاص جبریل کے طریق علاج سے ایک مثال پیش کروں گا۔

مورخ الطبری کہتے ہیں کہ جبریل ہر سال دو بار ہارون الرشید کی فصد کھولتا تھا اور تمام تر وہی لوازم اختیار کرتا تھا جو حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے مخصوص تھے۔ (طبری جز ۱۰ ص ۱۱)

طبقات الاطبّاء میں جبریل کے تذکرہ میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ (طبقات الاطبأ۔ جلد اوّل ص ۳۶)

بلاشبہ جبریل عربی الاصل نہ تھا اور مسلمان بھی نہ تھا۔ ایرانی اور عیسائی تھا مگر اسلام اور ہادئ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بہت متاثر تھا اور طبِ عربی کا اور عرب خون کا مزاج شناس تھا۔

یہ تاریخ طبِ عربی کی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ جبریل کی طرح کئی اور غیر مسلم طبیبوں نے بنی عباس اور اندلسی بادشاہوں کے درباریوں

میں نمایاں جگہ پائی تھی ان میں سے کئی نے جبرئیل کے طریق کار ایسا طرز عمل اپنایا اور آخر وقت تک مسلمان نہ ہوئے۔ اس کے باوجود انھیں اسلامی درباروں میں منزلت نصیب رہی کہ اسلام رواداری کا مذہب ہے اور حضور سرورِ کون و مکان تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں جبر کو جائز نہ سمجھتے تھے اور یہ حضور کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ نہ بنو عباس نے اور نہ اندلسی بادشاہوں نے اپنے درباروں سے وابستہ ہونے والے غیر مسلم طبیبوں سے کوئی تعصب برتا۔ صرف حضورؐ کے ارشاد کے مطابق حکمتِ گم گشتہ کو متاعِ مومن جانا۔ اور غیر مسلم طبیبوں کی طبی مہارت و ذہانت پر کوئی قدغن نہ لگائی۔ اور ان کے مشاہدات و تجربات کو عوام الناس کی عمومی پونجی قرار دیا اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی درباروں میں جو غیر مسلم طبیب بھی آئے ان میں سے اکثر نے اسلام کی سچائی تک پہنچنے میں زیادہ تامل و تذبذب نہ برتا۔ بہر حال جو چند اپنے مذہب پر قائم رہے ان سے کوئی تعرض نہیں ہُوا۔ اور انھیں اس بات کی مکمل اجازت رہی کہ وہ طبی تحقیقات و جستجو میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو ہر طور پر آزمائیں کہ وہ بھی اسلامی مملکت کے ویسے ہی شہری تھے جیسے کہ عرب یا دوسرے مسلمان تھے۔

مجھے یہاں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ طب عربی بغداد کے مسلمان تاجداروں ، اندلس کے امویوں اور مابعد کی مسلمان بادشاہتوں کے دَور میں طبِ عربی کی نسبت سے طب اسلامی بن گئی تھی۔ اور اس کے

دامن سے وابستہ جواہر آبدار علاقائی اور نسلی حد بندیوں سے قطعاً مبرا تھے اور وہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو دوسرے فنون کی تھی کہ اسلام علاقوں اور نسلوں کے اندر محدود رہنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ نہ عرب کے لیے ہی مخصوص تھا۔ نہ عجم کے لیے۔ وہ ایران کے لیے بھی تھا عراق کے لیے بھی شام کے لیے بھی تھا حجاز کے لیے بھی۔ یمن کے لیے بھی تھا اور سندھ و کابل کے لیے بھی۔ وہ مصر کے لیے بھی تھا اور افریقہ کے صحراؤں، ریگ زاروں اور سبزہ زاروں کے لیے بھی۔

یہی وجہ ہے کہ علوم حدیث و فقہ، تفسیر و ادب میں بخاری و مسلم، نسائی و ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد، الطبری و مسعودی، ابن اثیر و ابن کثیر، شافعی و حنبل، ابوحنیفہ و ابویوسف رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح غیر عرب مسلمانوں کے اندر سے طب سے وابستہ علماء و حکماء میں رازی، سجستانی، مروانی، جبریل، اصطرلابی، ابوالوفا، بوزجانی، فجندی، احمد بلخی، فارابی، بحریطی، عمر خیام طوسی، بوعلی سینا، زہراوی ابن الہیثم، البیرونی، اسفرازی، بیہقی اور خوارزمی جیسے نادر الوجود اوپر کو ابھرے اور ایسی ایسی ایجادات سے بنی نوع انسان کو نوازا جن کی مثال پوری تاریخ طب میں موجود نہ تھی۔

مَیں قدیم یونانی حکما کا بہت مداح ہوں اور یہ بات مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنے دَور میں طب کی بڑی خدمات انجام دی تھیں اور اس فن شریفہ کو بڑا اجلال بخشا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اس امر پر مُصر ہوں

کہ اسلامی دَور کے اطبأ نے فن طب و ادویہ سازی میں جو وسعتیں پیدا کیں اور اَن تھک محنت اور غیر معمولی جستجو کے سبب جو عظیم اور غیر فانی کارنامے انجام دیے تھے ۔ وہ پہلے دَور کا کوئی حکیم اور طبیب نہ دے سکا تھا۔

یہ محض میرا ہی خیال نہیں ہے۔ طب عربی یا طب اسلامی پر جن غیر متعصب علماء نے کتابیں لکھی ہیں انھوں نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ نئی کیمیا و ادویہ سازی کا پہلا موجد جابر بن حیان کوفی کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ اسی طرح ابوالقاسم زہراوی، ابوالوفا بوزجانی، اصطرلابی، مجریطی، جلجل و ابن الوافہ، ابن الہیثم، البیرونی، عمر خیام، امام رازی اور بو علی سینا نے طب عالم کو جو کچھ دیا ہے، ان کے سوا کوئی اور نہیں دے سکا ہے۔

مشہور محقق میکڈانلڈ براؤن اور سکاٹ تو یہاں تک مانتے ہیں کہ جدید طب و ادویہ سازی حتیٰ کہ جراحی کی ساری عمارت ان ہی بنیادوں پر کھڑی ہے جو مسلمان اطباء خصوصیت سے رازی، الزہراوی، اصطرلابی، ابن جلجل، ابن الہیثم، بو علی سینا، عمر خیام، فارابی اور خوارزمی نے متعارف کرائی تھیں۔

سکاٹ نے اپنی تاریخ اندلس میں کئی ہزار جڑی بوٹیوں کا شمار کیا ہے جو اندلس کے طبیبوں نے اندلس کے مختلف مقامات پر از خود اگائی تھیں۔ سکاٹ ایسے ادویہ سازی کے بڑے بڑے کارخانوں اور ہسپتالوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جہاں بالکل جدید پیمانہ پر مختلف ادویہ کے سفوف اور ٹکیاں تیار کی جاتیں۔ عمل جراحی

میں جو اوزار استعمال کیے جاتے، وہ آج تک یورپ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہیں کہیں حجم بدل گئے ہیں۔ چمک دمک بڑھ گئی ہے۔

یہ موضوع بڑی فرصت کا محتاج ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ نئے دَور کی تمام ترطبی ایجادات و اختراعات صرف اس لیے ممکن ہوئیں کہ آٹھویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری سے لے کر سترھویں صدی عیسوی اور گیارھویں صدی ہجری تک کے دَور میں اسلام اور مسلمان قوم نے من حیث الجماعت طب و ادویہ سازی کو ایک مقدس فریضہ جان کر اپنے کندھے اور دوسرے اعضا اس کی نشو و نما کے لیے مخصوص کر رکھے تھے اور اسے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

مجھے پُورا پُورا اعتراف ہے کہ مغرب طب وادویہ سازی اور سائنسی انکشافات و ایجادات میں اس وقت بہت آگے نکل گیا ہے اور اس نے بڑی لمبی مسافت طے کرلی ہے، لیکن یہ طویل سفر ہم ہی نے شروع کیا تھا، اس کے تمام تر راستے ہم ہی نے اپنے بنائے ہوئے چراغوں سے سجائے تھے، سارے سنگِ میل ہم ہی نے نصب کیے تھے اور اس عظیم مقصد کی لگن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سینۂ آدمی میں پیدا کی تھی۔

میں گنبدِ خضرا کی طرف دیکھ رہا ہوں
کوثر مرے نزدیک یہ معراجِ نظر ہے

باب سوم

ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی
شانِ رسالت

- حضورؐ پر ایمان ضروری ہے
- حضورؐ امراضِ رُوح کے سب سے بڑے معالج تھے
- انسانیت کا سہارا
- سب سے بڑا معجزہ
- حضورؐ کا اسوۂ حسنہ
- حضورؐ کی امتیازی حیثیت

حضورؐ پر ایمان ضروری ہے

بعض حضرات کے نزدیک حضورؐ پر ایمان لانا نجات کے لیے لازمی شرط نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی آپ کی بعثت کے بعد بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر عمل پیرا رہے تو قیامت کے روز اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء نے بھی کچھ اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن قرآن و حدیث اور خود آپؐ کے اور صحابہ کرام کے عمل سے اس نظریہ کی مکمل تردید ہوتی ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے، حضورؐ نے فرمایا :

لَا تَسْأَلُوا اَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوكُمْ وَقَدْ ضَلُّوا فَإِنَّكُمْ إِمَّا اَنْ تُصَدِّقُوا بِبَاطِلٍ اَوْ تُكَذِّبُوا بِحَقٍّ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ اِلَّا اَنْ يَّتَّبِعَنِي (مسند احمد)

"اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کیونکہ جو خود گمراہ ہو چکے ہیں وہ بھلا تمھیں کیا راہ دکھائیں گے۔ اگر تم ان کی تصدیق کرتے ہو تو احتمال ہے کہ تم کسی غلط بات کی تصدیق کر بیٹھو اور اگر تکذیب کرتے ہو تو اس کے برعکس ممکن ہے اگر خود موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ موجود ہوتے تو انھیں بھی سوائے میری پیروی کے تورات کی پیروی کرنا حلال نہ ہوتا۔

قرآنِ حکیم نے ان لفظوں میں اہلِ کتاب کو حضورؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی ـــــ

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ۔ (الاعراف)

جو اس پیغمبر، نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

قرآن نے دعویٰ کیا کہ جو لوگ کتبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں وہ حضورؐ کی رسالت کے منکر نہیں ہو سکتے۔ سورۂ رعد میں کہا گیا:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ع

یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خُدا کے بھیجے ہُوئے نہیں ہو، کہو میرے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر ہر اُس شخص کی گواہی جو

کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے۔

مذکورہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ حضورؐ کی بعثت کے بعد عیسائیوں اور یہودیوں سمیت ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ پر ایمان لائے۔ خود تورات اور انجیل میں ہزار تحریفات کے باوجود آج بھی وہ واضح اشارات موجود ہیں جن میں حضورؐ کی آمد کی بشارت دینے کے بعد آپ کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت امام ابن تیمیہ نے ایسی تمام پیشین گوئیوں کی تشریح کے ساتھ اپنی ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے جن کو پڑھنے کے بعد ان "کتاب خوانوں" کی قسمت پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے جو ان شہادتوں کے باوجود بھی نعمتِ اسلام سے محروم ہیں۔

تورات استثناء باب اٹھارہ آیت ۱۵ میں ہے:

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھر لو۔"

استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ میں کہا گیا

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ مَیں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔"

یوحنّا کی انجیل میں ہے:

"جب وہ مددگار وکیل آئے گا جس کو میں
تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی
کا رُوح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی
دے گا۔" (باب ۱۵ - آیت ۲۶)

اور یہ حوالہ دیکھیے کتنے غیر مبہم انداز میں حضورؐ کی آمد کی بشارت دی گئی:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر
طلوع ہُوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر
ہُوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے
ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی!"

(استشناء باب ۳۳، آیت ۲)

حضورؐ امراضِ رُوح کے سب سے بڑے معالج تھے

ایک حکیم اور ڈاکٹر سے پوچھیے وہ آپ کو بتائے گا کہ ایک بچّے، جوان اور سن رسیدہ و معمر آدمی کا علاج کرنے میں ایک ہی نسخہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ ایک بچّے کے لیے دوا کی جو مقدار ہوتی ہے۔ وہ ایک جوان یا معمر آدمی کے لیے کام نہیں دیتی۔ اسی طرح علاج معالجہ کرتے وقت ایک مریض کی طبیعت اور ماحول کو بھی خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ایک بلغمی مزاج کے آدمی کے لیے دوا اور اس کی مقدار کچھ اور ہے اور ایک صفراوی مزاج کے بیمار کے لیے کچھ اور —— ایک سرد علاقے کا رہنے والا شخص ایک گرم علاقے میں رہنے والے شخص سے مختلف نوعیت کے معالجاتی مطالبے رکھتا ہے، اور اگر ایک ڈاکٹر سے کہا جائے کہ وہ اس فرق کو ذہن میں رکھے بغیر امراضِ جسمانی کا علاج کرے تو وُہ کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اب آپ اسی سے امراض روحانی اور ان کے معالجین کا طریقہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ دُنیا کے آغاز سے ہماری روحانی بیماریوں کو دُور کرنے کے لیے اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آدم اور نوح علیہ السلام کے زمانے کی شریعت آج بھی انسانیت کے روگوں کا شافی علاج ہے تو یہ اس کی کم فہمی اور ناسمجھی ہوگی۔ انسانیت کے بچپنے میں جو آسمانی شریعتیں نازل کی گئی تھیں وہ اس کے عہد شباب میں کام نہیں دے سکتیں۔ ہر دَور کا مزاج اور بیماریاں جدا جدا ہیں اور اگر احوال و ظروف اور طبائع کے اختلاف کا لحاظ کیے بغیر ان کا علاج کیا جائے تو وہ کارگر ثابت نہیں ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاءؑ کے عہد تک ذہن انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس لیے جو شریعتیں ان کو دی گئیں وہ ہمارے دُکھوں کا مداوا نہیں ہو سکتیں۔ ضرورت تھی کہ ان کے بعد زمانہ جو ارتقائی منازل طے کرنے والا ہے ان میں راہنمائی دینے کے لیے ایک کامل اور جامع شریعت نازل کی جائے جو رہتی دُنیا تک انسان کی روحانی احتیاجات کی ضامن اور کفیل ہو۔ یہی شریعت خاتم الانبیا حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور آپ کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے پہلی تمام شریعتیں منسوخ کر دیں۔

اب اگر کوئی شخص حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ پر ایمان لاتا ہے، لیکن آنحضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کا انکار کرتا ہے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ہم ایک فن کے علماؒ کو تو مان لیں لیکن اس کے امام

اور ماہر خصوصی کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ حضرت امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "الجواب الصحیح" میں اس کی بعض دلچسپ مثالیں دی ہیں۔ فرماتے ہیں:

"یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے زفر بن القاسم مزنی اور اثرم تو بڑے فقیہہ تھے لیکن ابو حنیفہ، شافعی اور مالک فقیہہ نہیں تھے، یا کہے کہ ملکی اور مسیحی وغیرہ طب کے مصنفین تو بے شک اطباء تھے مگر بقراط و جالینوس وغیرہ طبیب ہی نہیں تھے یا کہے کہ کوشیا اور خلفی تعلم ہیئت سے واقف تھے لیکن بطلیموس وغیرہ کو ہیئت کا کوئی علم نہیں تھا یا کوئی کہے کہ داؤد و یلیخا و حاقوس اور دانیال تو ضرور پیغمبر تھے لیکن محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی نہیں تھے اس شخص کا تناقض اور اس کے قول کی نامعقولیت اوپر کے تمام اقوال سے زیادہ روشن ہے۔"

اِنسانیت کا سہارا

دُنیا کے لوگ سہاروں کے بڑے قائل ہیں انھیں دولت و ثروت ، اعزّا و اقربا اور اسباب و وسائل کے سہارے حاصل نہ ہوں تو یہ ہمّت ہار بیٹھتے ہیں۔ قدم قدم پر انھیں ان جھوٹے سہاروں کی ضرورت رہتی ہے اور دیکھا جائے تو اس عالم اثبات میں اس کے بغیر کوئی چارہ ہے بھی نہیں —— اور زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے آدمی ان بیساکھیوں سے کلیتہً بے نیاز ہو بھی نہیں سکتا۔

مگر تاریخ کی حد تک ایک استثناء اور حیرت انگیز استثناء وہ ہے جو محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے معاملے میں پایا جاتا ہے۔ دُنیا میں جتنے سہارے شمار کیے جا سکتے ہیں۔ حضورؐ کو ان سب سے محروم رکھا گیا مگر دُنیا نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی بے سہارا جو اس کے نزدیک یتیم عرب کی حیثیت رکھتا تھا ، ایک وقت آیا کہ بھولی بھٹکی انسانیت کا سب سے

بڑا سہارا بن گیا۔

والد کی شفقت اور محبّت کو ترقی کا زینۂ اوّل سمجھا جاتا ہے وہ آپ کو میسّر ہی نہیں ہوئی۔ والدہ کی شکل میں اس کمی کے پورا ہونے کا امکان تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد والدہ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ دادا نے چاہا کہ وہ آپ کو سینہ سے لگائے اور پیار سے رکھے مگر "دست غیب" محمدؐ کے معاملے میں دُنیا کے کسی سہارے کی شراکت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا وہ بھی خدا کو پیارے ہوئے اور اب یہ بچّہ نہ ماں باپ رکھتا تھا نہ شفیق و خلیق دادا کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔ مہربان چچا آگے بڑھے اور کوئی شک نہیں کہ انھوں نے دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ لیکن تاریخ سے پوچھو تاریخ بتائے گی کہ اس کا ـــــ جسے آدمیت کا سہارا بننا تھا سہارا وہ بھی نہیں بن سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ بکریوں اور اونٹوں کو چرا کر جو معاوضہ پاتے تھے اس سے ابوطالب کا گزارہ چلتا تھا اور آپؐ کے چچا کی یہ حالت تو تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انھوں نے معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ایک لختِ جگر جعفر طیار کو اپنے بھائی حضرت عباسؓ کے حوالے کر دیا تھا ـــــ اس حالت کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ حضورؐ کا سہارا بن سکتے تھے بلکہ بنظر انصاف دیکھا جائے تو یہ ضرور ہے کہ آپؐ چچا کی معاشی زندگی کا سہارا بن گئے۔

دُنیا والے علم و فضل کے لیے مکتب و مدرسہ کی سند کے محتاج ہیں وہ کسی عالم اور فاضل کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں تب کہیں آداب

زندگی سیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ آپؐ کی تعلیم و تربیت براہ راست خالق اکبر کے ذمے تھی اور اس نے دکھا دیا کہ محمدؐ نے اس پہلو میں بھی کسی مُعلّم اور کسی مکتب کو سہارا نہیں بنایا۔ ہم دولت کی پوجا کرتے ہیں اور اس کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے۔ روپیہ ہمارے نزدیک کامیابی کی کلید ہے یہ نہ ملے تو ترقی کا دروازہ ہمارے لیے مقفل رہتا ہے اور مل جائے تو پھر ہم اسے ٹھاٹھ باٹھ جمانے اور رعب گانٹھنے کا ذریعہ بناتے ہیں مگر تم دیکھو گے کہ محمدؐ کو حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد یہی دولت ملی مگر انھوں نے اسے جاہ و منزلت کے حصول کے لیے سہارا بنانے کی بجائے غریبوں، بیواؤں اور یتیموں میں لُٹا دیا۔

ہم قوم اور وطن کو فرد کی کامیابی اور کامرانی میں بڑا دخیل مانتے ہیں۔ خاکِ وطن کا ہر ذرّہ ہمارے لیے دیوتا کا مقام رکھتا ہے۔ مگر یہاں یہ دیکھو گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے وُہ قوم کی حیثیت سے اپنا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ قبیلوں میں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ایک بھیڑ تھی جس کے تصوّرات پست تھے اور عادات قبیح و شنیع تھیں۔ اور وطن ایک ایسی سرزمین تھی جو وادی غیر ذی زرع کہلاتی تھی۔ جس میں لُو کے جھکڑ چلتے تھے اور جو ٹیلوں اور پتھروں کے علاوہ اپنے دامن میں کچھ رکھتی ہی نہیں تھی —— ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو جو محیّر العقول کامیابی حاصل ہُوئی۔ اس میں قوم اور وطن کی موزونیت کا بھی کچھ ہاتھ ہو گا؟

یوں آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دُنیا میں جتنے سہارے اور آسرے گِنے جاتے ہیں، ان میں سے ایک سہارا بھی حضورؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود آپؐ کو جو کامیابی نصیب ہُوئی، آپؐ جو تعلیمات لے کر آئے جس علم و فضل کا مظاہرہ کیا، دُنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سوچیے!

کیا یہی ایک دلیل آپؐ کی صداقت کا اعتراف کرانے کے لیے کافی نہیں ہے؟ ؎

سب سے بڑا معجزہ

دُنیا میں جتنے انبیائے کرام تشریف لائے ہیں ان سب کو منکرینِ نبوّت کی آنکھیں کھولنے کے لیے مختلف معجزات عطا ہُوئے مگر آج وہ واقعہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ ان کا علم ہمیں کُتب آسمانی یا تاریخ سے ہوتا ہے۔ مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات ایسے ہیں جو آج تک موجود ہیں اور یقیناً رہتی دُنیا تک موجود رہیں گے۔ منکرینِ حق چاہیں تو آج بھی انھیں دیکھ کر رسالت محمدّی کا ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ حضورؐ اُمّی تھے۔ آپؐ نے کسی سے ایک لفظ تک نہیں سیکھا، شعر و ادب کی مجلسوں تک سے دُور رہے، کسی مدرسہ میں آپؐ نے داخلہ نہیں لیا۔ نبوّت سے قبل کی زندگی بھی اس پاک بازی سے گزری کہ دوست دشمن آپؐ کی صداقت اور دیانت کے معترف تھے۔ ایسے میں اچانک

چالیس سال کے بعد دُنیا نے آپ کی زبان مبارک سے وہ کلام الٰہی سُنا جس کی فصاحت و بلاغت اور تعلیم وحکمت اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک ایسی کتاب جو علوم اوّلیں و آخریں کی جامع ہے۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بہترین ہدایات ہیں اور جس میں فرد سے لے کر ریاست تک کے لیے ایک بہترین نظام حیات ہے۔ ایک اُمّی کیسے پیش کر سکتا تھا۔ شبہ کرنے والوں نے شبہ کیا کہ شاید یہ بھی کوئی انسانی تصنیف ہے مگر خود قرآن نے چیلنج دیا:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ○ (بقرہ)

"اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندہ خاص پر تو اچھا۔ تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو اور بُلا لو اپنے حمائتوں کو خُدا سے جو الگ ہیں اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے ڈرتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔"

اس چیلنج کے مخاطب اوّل وہ لوگ تھے جن کی فصاحت اور بلاغت کا دُنیا لوہا مانتی تھی۔ جنھیں اپنی زبان دانی کا اتنا غرہ تھا کہ وہ اپنے سوا دوسرں کو "عجم" یعنی "گونگا" کہتے تھے ــــ یہ لوگ اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی دشمنی میں

خون کے دریا عبور کرنے کے لیے تیار تھے۔ مال و دولت خرچ کر رہے تھے اور قرآن کے اس چیلنج کے بعد ان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ وہ آپ کو شکست دے سکیں۔ مگر ان کی زبانوں پر مہر لگ گئی اور بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ اس کی نظیر پیش نہ کر سکے۔

فصاحت و بلاغت ہی نہیں علم و حکمت کے اعتبار سے بھی قرآن نے یہ چیلنج دیا مگر عہد نبوی پر موقوف نہیں آج چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی دُنیا اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مستشرقین ہی کو لے لیجیے۔ انھوں نے اسلام دشمنی میں آکر کیا کچھ نہیں کیا۔ اتہامات لگائے۔ مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی مگر قرآن کے اعجازِ بیان اور حسنِ معنی کے آگے وہ سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ حال ہی میں انگلستان سے ایک کتاب (WHAT HAPPEND IN HISTORY) شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں جہاں دوسرے مذاہب اور عقائد پر بحث کی گئی ہے وہاں اسلام کا بھی ذکر آیا ہے۔ قرآن کے متعلق مضمون کی ابتدا میں مصنّف لکھتا ہے:

"قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس کا مصنّف خواہ کوئی ہو اپنے زمانہ ہی کا نہیں، بلکہ بہت سے زمانوں کا ایک زبردست مُعلِّم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کا مصنّف ایک برہانی اور عقلی دماغ کا "انسان" ہے۔ وہ اپنے ہر مضمون میں اس بات کی بڑی احتیاط کرتا ہے کہ دعویٰ بلا دلیل نہ ہو ــــ اس کا اندازِ فکر اس حکیم سے ملتا ہے جو صرف کائنات

پر غور کرتا ہے اور اس سے نتائج اخذ کرتا ہے قرآن کی یہ خوبی پہلے تو انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے، پھر اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور آخر میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔"

دُنیا میں متعدد کتابوں نے اپنے قارئین سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اَن گنت تحریریں انسانی مزاج اور عادات واطوار پر اثر انداز بھی ہوئی ہیں لیکن قرآن نے انسانی زندگی میں جو حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا ہے اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے اونٹ چرانے والوں کو انسانوں کا گلّہ بان اور جہالت میں ڈوبے ہوئے بدوؤں کو دُنیا بھر کے لیے مُعلّمِ اَخلاق بنا دیا اس نے ایک طرف خالد، طارق اور محمدؒ ابن قاسم جیسے سپہ سالار پیدا کیے تو دوسری طرف علیؓ، عائشہؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ جیسے علماء فضلاء، ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عمر ابن عبدالعزیزؒ جیسے حکمران بھی اسی کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے اور حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے درویش بھی اسی کے جمال جہاں آرا سے مستنیر۔

سُورج اور چاند کی روشنی تو زیادہ سے زیادہ ظاہری اندھیروں کو ختم کرتی ہے مگر قرآن وہ نُور ہے جس نے دلوں کی ظلمتیں بھی دُور کر دیں اور انسانوں کے ظاہر ہی نہیں باطن بھی منوّر کر دیے۔

دُنیا کی دوسری قومیں بھی اپنے "صحائف" اور متبرک کتابوں کو مقدس مانتی ہیں مگر قرآن نے انسانی قلوب پر اپنی تقدیس وعظمت کا جو نقش قائم کیا ہے اسے خنجر وشمشیر سے بھی نہیں کھرچا جا سکتا۔ دُنیا والے کئی کتابوں

میں دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ متبرک و مقدس ہیں، حق تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ لیکن آج کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کے حافظے میں یہ کتابیں محفوظ ہیں، اوّل تو یہ کتابیں حفظ ہونے ہی میں نہیں آتیں اور اگر کوئی من چلا اس ناممکن کو ممکن بنا بھی دے تو چند دنوں کے بعد یہ آپ سے آپ حافظے سے نکل جاتی ہیں۔ مگر قرآن حکیم وہ زندہ کتاب ہے جو اس دورِ زوال میں بھی لاکھوں سینوں میں محفوظ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک کی نوک زبان ہے یہاں تک کہ اگر خدانخواستہ اس کے سارے نسخے ناپید کر دیے جائیں تب بھی ان عاشقانِ قرآن کے سینوں سے اس امانت کو زیر زبر پیش کے ساتھ پھر سے سینوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یوں ماننے کو ماننے والوں نے بہت سی کتابوں کو مانا ہے مگر کون سی وہ کتاب ہے جس نے اپنے ماننے والوں کو اس حد تک مسخر کیا ہو کہ وہ اس کے لکھنے کا معاوضہ بھی قبول کرنے سے احتراز کرتے ہوں، اورنگ زیب عالمگیر کا ایک وصیت نامہ بزبان فارسی اورنگ آباد دکن میں محفوظ ہے جس میں انھوں نے بتلا دیا کہ میرے ترکہ میں نقد روپیہ کی تفصیل یہ ہے۔ فلاں بی بیؒ کے پاس اتنے درہم ہیں جو میں نے رومال اور ٹوپیوں کی کشیدہ کاری کر کے کمائے ہیں۔ فلاں کے پاس اتنے درہم ہیں جو قرآن مجید کی کتابت کی مزدوری سے حاصل کیے ہیں۔ یہ رقم اگرچہ کچھ زیادہ ہے لیکن میرا دل نہیں چاہتا کہ اللہ کی آیات لکھ کر فروخت کرنے سے جو رقم حاصل ہوئی اس سے مجھ پر کفن ڈالا جائے۔ اگرچہ حقیقتاً یہ آیات الٰہیہ کی بیع ممنوع میں داخل نہیں۔ مگر صورت میں اس کے مشابہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے

سامنے حاضری کے وقت اس قسم کا کفن ہونے سے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لیے دوسری رقم جو رومال اور ٹوپیوں کی مزدوری سے حاصل شدہ ہے وہ اگرچہ کم ہے مگر اس سے معمولی قسم کا کپڑا خرید کر میرا کفن بنا دیا جائے۔

اس درویش بادشاہ کی یہ وصیت اصل میں اس تعلیم قرآنی پر عمل کرنے کا ایک محتاط ترین نمونہ تھی جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کی آیات ثمنِ قلیل کے عوض فروخت نہ کرو، رضائے خداوندی تو اس کا بدل بن سکتی ہے دُنیا کی کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

دُنیا میں جن کتابوں کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان سب میں اصل متن کی حفاظت کے لحاظ سے بھی قرآن حکیم ایک مابہ الامتیاز حیثیت کا حامل ہے۔ اوّل تو قرآن حکیم کے سوا دُنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ ہی نہیں کرتی کہ اس کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں۔ کتاب مقدس تک کے بارے میں اس کے ماننے والوں کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ خُدا کا کلام ہے مگر قرآن حکیم نہ صرف اپنے ایک ایک لفظ کو کلام الہٰی کہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اے پیغمبر تجھ پر جو "ذکر" نازل کیا جا رہا ہے اس کی حفاظت ہم خود کریں گے۔ یہ اہتمام کسی کلام کو نصیب نہ ہو سکا کہ اسے لفظ بہ لفظ لاکھوں کروڑوں سینوں میں محفوظ کر لیا جائے۔ یہ خصوصیت فقط قرآن کو حاصل ہے کہ یہ عہد نبوی سے لے کر اس عہد زوال تک ہر دَور میں لاکھوں انسانوں کے نوک زبان رہا ہے۔

پھر خاتم الانبیاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم الشان معجزہ کا ایک پہلو اور بھی ہے ۔۔۔ سب کو معلوم ہے کہ مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں آنحضورؐ کو آزادی کے صرف دس سال گزارنے کا موقع ملا۔ ان دس سالوں میں بھی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو چھ سال جہاد و قتال میں صرف ہو گئے اور یہود اور کفار و منافقین کے ساتھ بیشتر معرکے اس زمانے میں پیش آئے۔ اس حساب سے مدینہ میں آنحضورؐ کو قرآن کی بنیادوں پر ایک نظام حکومت قائم کرنے کے لیے صرف چار سال کی مہلت ملی مگر اس مختصر سے عرصہ میں جو نظام قائم ہُوا اپنے تو اپنے غیر بھی اس کے معترف ہیں کہ اس آسمان کے نیچے وہ ایک لاجواب اور بے مثال نظام تھا۔ حکومتوں کی عملداری صرف جسموں پر قائم ہوتی ہے مگر قرآن کی بنیاد پر جو حکومت قائم ہوئی تھی۔ رُوحوں کی دُنیا میں بھی اس کا قانون نافذ ہُوا۔ دن کے اُجالے میں اور رات کی تاریکی میں کھُلے اور چھپے ہر مقام اور ہر وقت میں اس حکومت کی رعایا نے شریعت کا احترام کیا اور تنہائی میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے حاکم وقت کے پاس خود چل کر آئے کہ انھیں سزا دی جائے۔

پھر ۔۔۔ قرآن نے نظام حکومت چلانے کے لیے جو رہنمائی دی ہے وہ کسی خاص وقت اور مقام تک محدود نہیں۔ آج بھی اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو انسانی زندگی تمام فتنوں اور مصیبتوں سے پاک اور صاف ہو جائے۔

(WHAT HAPPEND IN HISTORY) کا مصنف لکھتا ہے:

"میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ یورپ کے معاہدے، یورپ کی دفاعی تدابیر، یورپ کا سیاسی اتحاد اور بین الاقوامی پارلیمنٹ یا حکومت کی تجویز اور دوسری تمام تدابیر ناکام و بے سود رہیں گی اگر اس کی بنیادوں میں خدا کے تصوّر اور اخلاقی قدروں کو جگہ نہ دی گئی۔ جہاں عالمی امن کے لیے بہت سے نسخے آزمائے ہیں وہاں مذہب کا یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لینا چاہیے۔ اگر اس کے لیے کوئی تیار ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ وہ اس سلسلہ میں قرآن کو ہرگز نظر انداز نہ کرے کیونکہ اس راہ کی راہنمائی اس کتاب سے بہتر کوئی اور کتاب انجام نہیں دے سکتی۔"

اعجاز قرآنی کا یہی وہ پہلو تھا جسے دیکھ کر انگلستان کا مشہور مورخ رگبن بے اختیار پکار اٹھا:

"قرآن کی نسبت بحر اطلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی رُوح ہے۔ قانون کی اساس ہے اور صرف اصول مذہب کے لیے نہیں بلکہ احکام تعزیرات کے لیے اور قوانین کے لیے بھی ہے ــــ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے۔ یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتّب ہوئی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔"

حضورؐ کا اسوہ حسنہ

تاریخ میں آج تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ مجرد کسی کتاب نے دُنیا میں انقلاب برپا کیا۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی اصول سے صحیح معنوں میں متاثر نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی عملی نمونہ اس کے سامنے نہ آجائے۔ قرآن آج بھی موجود ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی میں صحابۂ کرام کے کردار کی جھلک تک نہیں پائی جاتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں اب وہ انقلاب انگیز اثرات و خصوصیات باقی نہیں رہیں۔ نہیں وہ جوں کی توں موجود ہیں اور ابد تک موجود رہیں گی مگر فرق صرف یہ واقع ہو گیا ہے کہ ہمیں اس معلم اور مزکّی کی معیت اور صحبت حاصل نہیں جس کی حیات پاک کا ایک ایک لمحہ قرآن کی زندہ تشریح و تفسیر تھا۔ خود قرآن نے کہا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا

عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (الجمعہ ۱)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔

اب اگر اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ارشادات کو دلیل راہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی میں تمھارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ (احزاب)

دُنیا میں بہت سے لوگوں نے وعظ کیے ہیں اور بڑے اچھے انداز میں کیے ہیں۔ اصول پیش کیے ہیں اور سنہری اصول پیش کیے ہیں مگر بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے ان پر عمل کر کے دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کی ہوں، یہ شان آپ کو اس معلمِ انسانیت کی زندگی میں نظر آئے گی کہ جو بات فرمائی سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا۔ آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ پانچ وقت کی نماز پڑھنی چاہیے۔ مگر آپ خود صرف پانچ وقت کی نہیں آٹھ وقت کی نماز ادا فرماتے تھے۔ چاشت، اشراق اور تہجد کے نوافل پانچ نمازوں کے علاوہ تھے اور نمازیں بھی کیسی نمازیں کہ صحابہ کہتے ہیں۔ نماز پڑھتے وقت ہم آپؐ کے سینہ کی آواز اس طرح سنتے تھے جیسے ہانڈی میں اُبال آتا ہے۔

• نمازوں میں روتے کی وجہ سے آپ کے سینۂ مبارک میں چکی چلنے کی آواز آتی۔ رات رات بھر خُدا کے حضور مصلیٰ پر کھڑے رہتے، یہاں تک کہ پاؤں سُوج جاتے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ عرض کرتیں "یارسول اللہ! آپ تو معصوم ہیں آپ کو اس عبادت و ریاضت کی کیا ضرورت ہے" اور حضورؐ فرماتے: "افلا اکون عبداً شکورا۔" "کیا میں خُدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔"

آپؐ نے یہ ہدایت کی کہ سال بھر میں ایک ماہ کے روزے رکھنے چاہئیں مگر خود اپنا عمل یہ تھا کہ سال میں کوئی مہینہ بلکہ کوئی ایسا ہفتہ نہ گزرتا تھا جس میں حضورؐ روزے سے نہ ہوں۔ اور روزے بھی ایسے روزے کہ ایک دن نہیں مسلسل دو دو تین تین دن بن کھائے پیے گزر جاتے۔ صحابہ عرض کرتے "یارسُول اللہ کیا اس سلسلے میں ہم بھی آپ کی پیروی کریں" اور حضورؐ جواب دیتے "نہیں تم اس معاملے میں میری پیروی نہیں کر سکتے مجھے تو میرا آقا و مولا کھلا پلا دیتا ہے۔"

زہد و قناعت کی تلقین فرمائی تو یہ نمونہ پیش فرمایا کہ سلطانِ عرب ہونے کے باوجود چٹائی پر سوتے اور اٹھتے تو آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے۔ صحابہ عرض کرتے "یا رسُول اللہ اجازت ہو تو ہم آپ کے لیے ایک بچھونا تیار کر لیں۔" تو آپؐ فرماتے "مجھے دُنیا سے کیا کام۔ میری مثال تو اس مسافر کی ہے جو تھوڑی سی دیر کے لیے درخت کے سائے تلے آرام کرے اور پھر اس کو چھوڑ کر چل دے" ــــ دُنیا نے فقر و

درویشی کے کئی مناظر دیکھے ہوں گے مگر یہ کم دیکھا ہو گا کہ سرورِ کائنات کی لختِ جگر آئے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہاتھ کے چھالے دکھائے، کہے "ابّا جی، دیکھیے چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ مشکیں ڈھوتے ڈھوتے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں۔ ابّا جی مجھے بھی خادمائیں عطا ہوں۔" اور حضورؐ ارشاد فرمائیں "فاطمہ یہ خادمائیں تمھیں نہیں مل سکتیں۔ یہ تو مدینے کی بیواؤں اور محتاجوں کے لیے ہیں" ــــــ دُنیا کی کس "شہزادی" نے یہ نظیر پیش کی ہو گی؟

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

کون ہے جس کو مال و دولت اور سیم و زر کی پیش کش کی گئی ہو اور وہ اس پر زہد کی زندگی کو ترجیح دے۔ حضورؐ فرماتے ہیں حق تعالیٰ نے مکہ مکرّمہ کے اس پتھریلے میدان کو سامنے کر کے مجھ کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر مَیں پسند کروں تو وہ اپنی قدرت سے اس کو سونا بنا دے۔ مَیں نے عرض کی۔

"پروردگار! مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر رہوں تو ایک دن بھوکا بھی رہوں۔ جب بھوکا ہوں تو تیرے سامنے گریہ زاری کروں اور تیری یاد کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد و ثنا کروں اور تیرا شُکر بجالاؤں۔" (احمد و ترمذی)

حضورؐ نے اگر طلبِ علم کی نصیحت فرمائی اور یہ کہہ کر فرمائی کہ اس کے لیے چین بھی جانا پڑے تو بھی گریز نہ کرو۔ تو علم کے لیے ذوق و شوق کی یہ عملی مثال بھی دُنیا کے سامنے پیش کی کہ ابتدا میں جب کبھی وحیِ الٰہی کا

سلسلہ کچھ مدت کے لیے رُک جاتا۔ آپ سخت بے چین ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے آپ زندگی سے بیزار ہیں۔ خود قرآن نے شہادت دی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قیامہ)

قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو اس لیے حرکت نہ دیجیے کہ آپ اسے جلد اخذ کر لیں، یقیناً اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر ہمارے ہی ذمے اس کی تشریح بھی ہے۔

دُنیا نے زبان مبارک سے قل امنت باللہ ثم استقم کے الفاظ سُنے تو یہ کردار بھی دیکھا کہ پتھر کھائے جا رہے ہیں۔ طعنے سہے جا رہے ہیں۔ نظر بندی کی تکلیفیں برداشت کی جا رہی ہیں۔ چوٹی سے ایڑی تک خون بہہ رہا ہے مگر ایسے میں بھی استقامت و عزیمت میں فرق نہیں آتا۔ حضرت حق سے کوئی شکوہ و شکایت نہیں، التجا ہوتی ہے تو صرف یہ اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ اے پروردگار! میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ لوگ نہیں جانتے۔

حضورؐ کی امتیازی حیثیت

ہم جس دُنیا میں بس رہے ہیں۔ یہ مختلف النّوع طبقات انسانی پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی ہیں جن میں علم وفضل کا شہرہ ہے اور وہ بھی ہیں جو اپنی استعداد کے لحاظ سے بالکل جاہل اور بے علم ہیں۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ہر بات کو دلیل کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں اور ایسے افراد بھی بہت تعداد میں ہیں جن کی طبیعتیں خرق عادت افعال دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہوتیں۔ یہاں بادشاہ بھی رہتے ہیں اور گدا بھی۔ اور دیکھا جائے تو یہی وہ تنوّع اور اختلاف ہے جس پر اس عالم رنگ وبو کی تمام تر رعنائیوں کا دارومدار ہے۔ شاعر نے اگر کہا تو غلط نہیں کہا ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

دُنیا کی اس رنگا رنگی کے پیشِ نظر عقل تقاضا کرتی ہے کہ جس شخصیت

کو آدمیت کے لیے کامل نمونہ ہونے کا مقام حاصل ہو۔ وہ کسی ایک طبقہ اور گروہ ہی کے لیے اپنی زندگی میں رہنمائی کا سامان نہ رکھتی ہو بلکہ اس آفتاب صفت سیرت کی ضو پاشیاں ہر کہ و مہ کے لیے عام ہوں وہ پستیوں کو بھی اسی طرح جگمگا دے جس طرح بلندیوں کو۔ عالموں اور فاضلوں کے لیے بھی اس کے روشن کردار میں "برہان" رسالت ہو اور جاہلوں اور بدوؤں کے لیے بھی طمانیت قلب کا سامان۔ وہ صرف بڑے بوڑھوں ہی کو متاثر نہ کرے بلکہ اس کی پاک زندگی میں نوجوانوں کے لیے بھی ایک بہترین نمونہء عمل ہو۔ وہ بادشاہ و گدا اور امیر و غریب کو یکساں مستفیض و مستفید فرمائے۔ آپ اگر اس نقطۂ نظر سے حضورؐ کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ ؎

بہار عالم حسنش جہاں را تازہ می دارد
برنگ اصحاب صورت را ببوُ اصحاب معنیٰ را

دُنیا میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ سمیت جتنے بھی انبیأ تشریف لائے ہیں ان کی زندگی کے بہت کم حالات ہمارے سامنے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جن کے ناموں کے سوا اور کچھ معلوم ہی نہیں مگر جن کے متعلق دُنیا کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتی ہے ان کے متعلق بھی گنتی کے چند واقعات کے سوا باقی ماندہ تفصیلات ناپید ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ دُنیا کے دو عظیم مذاہب کے بانی سمجھے جاتے ہیں اور ان کے "پیروؤں" کی بڑی بھاری تعداد آج بھی رُوئے زمین پر موجود ہے مگر خود ان کی زندگی کے

بہت کم اجزاٗ محفوظ رہ سکے ہیں اور سچ پوچھیے تو ان اجزا کو بھی محفوظ نہیں کہا جا سکتا۔ تورات جس سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا سراغ ملتا ہے اس کے متعلق خود یہودی بتاتے ہیں کہ وہ کئی بار دُنیا سے غائب کر دی گئی۔ اس کے تمام نسخوں کو متعدد مرتبہ جلایا گیا۔ یہاں تک کہ اب صرف اس کے ترجمے باقی ہیں۔ اصل کتاب بے نشان ہو کر رہ گئی ہے اور عجیب ستم ظریفی یہ ہے کہ اس تورات میں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب مانا جاتا ہے حضرت موسیٰؑ کی تجہیز و تکفین کے قصے درج ہیں۔

انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کی سیرت کا واحد مآخذ بن سکتی تھی۔ اس کی صحت کا حال کچھ اس سے بھی خراب تر ہے۔ عیسائیوں کے ہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں انجیلیں پائی جاتی ہیں مگر آج ان میں سے صرف چار انجیلوں کو معتبر مانا جاتا ہے اور یہ چار انجیلیں بھی کیسے منتخب ہوئیں۔ یہ واقعہ بھی سُننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۳۲۵ء میں قسطنطین اعظم نے مشرقی روم کے ایک شہر نکیاہ میں پادریوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں تین سو پادری اطراف و اکناف سے شریک ہوئے۔ بادشاہ کی صدارت میں مسلسل دو مہینے تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ اسی دوران ایک گرجا میں دُعائیں مانگی گئیں کہ تمام انجیلیں جو جھوٹی ہیں وہ ضائع ہو جائیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُعا منظور کی اور چار انجیلوں کے سوا باقی تمام انجیلیں ضائع ہو گئیں۔ اس کے بعد سے یہی چار انجیلیں مستند و معتبر سمجھی جاتی ہیں۔

جن کتابوں کے "استناد" کا عالم یہ ہو اوّل تو ان پر اعتماد کیا ہی نہیں

جا سکتا، لیکن بفرضِ محال انھیں موجودہ شکل میں سچا تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان سے ان جلیل القدر انبیأ کے احوال اور تذکرے مرتب نہیں ہو سکتے۔ تورات کی اطلاع کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی عمر ایک سو بیس برس تھی۔ ان ایک سو بیس برسوں میں چند موٹے موٹے واقعات کے علاوہ ہمیں ایک خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی روزمرہ کی زندگی جماعتی معاملات و تعلقات کہیں زیرِ بحث نہیں آتے۔ انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کی عمر ۳۳ سال بیان کی گئی ہے مگر ان ۳۳ سالوں میں صرف آخری تین سالوں کے حالات انجیلوں سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ بقیہ زندگی پر تاریکی کے "دبیز" پردے پڑے ہوئے ہیں مگر جب وہ آیا جس کے متعلق مسیح یہ کہہ کر دُنیا سے تشریف لے گئے تھے کہ:

"میرا جانا ہی تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ آنے والا میرے جانے کے بغیر نہیں آئے گا۔"

تو اس کی زندگی کی جملہ تفصیلات کو نوعِ انسانی کی متاعِ عزیز کی حیثیت سے رہتی دُنیا تک کے لیے ہر التباس اور ہر شک و شبہ سے محفوظ کر دیا گیا۔

وُہ پاکباز انسان جنھوں نے گلشنِ انسانیت کے اس گُل سرسبز کی بُو باس کو سونگھا اور سونگھ کر ہم تک پہنچایا، ایک لاکھ سے زیادہ شمار کیے گئے ہیں۔

تذکرۂ رسالت کے ایک ایک واقعہ کو عموماً آٹھ آٹھ دس دس راویوں نے بیان کیا ہے اور تاریخ کا یہ عظیم و جلیل تذکرہ اتنا مکمل اور اتنا جامع و

مانع ہے کہ گو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے رخصت ہو گئے لیکن آج بھی آپ کی پاک زندگی کا گوشہ گوشہ ہمارے سامنے کھُلی ہوئی کتاب کے مانند موجود ہے۔ یہاں کوئی سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ ملتا ہو کوئی شبہ ایسا نہیں جو دُور نہ ہوتا ہو۔ آپ چاہیں تو یہ تک معلوم کر سکتے ہیں کہ حضورؐ بالوں میں کنگھا کس طرح فرماتے تھے۔ حضورؐ سرمہ کس طرح ڈالتے تھے۔ حضورؐ کا جُوتا کس طرح کا تھا اور حضورؐ کا پسینہ کیسا تھا۔ یہ اور اس طرح کی تمام جزئیات آپ کو مرتّب شکل میں مل سکتی ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ کی یہ وہ امتیازی شان ہے جسے باسورتھ اسمتھ نے دیکھا تو یہ کہنے پر مجبور ہوگیا:

"کوئی شخص یہاں (محمدؐ کی سیرت) کے متعلق نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے۔"

اور پھر انھیں تذکروں پر موقوف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ تذکرے بھی نہ ہوتے تب بھی تنہا قرآن سے آپؐ کی زندگی پر اتنی روشنی پڑ جاتی ہے کہ کوئی چاہے تو فقط اسی سے آپ کی سیرت مرتب کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے آپ کی سیرت کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا۔ کان خلقه القرآن۔ آپ کی تصویر قرآن ہے۔ پھر دیکھنے والے دیکھیں اور سوچنے والے غور کریں تو انھیں نظر آئے گا کہ رسالت محمدی کی امتیازی حیثیت کچھ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ آپؐ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپؐ کی زندگی تمام انسانی جماعتوں اور گروہوں کے لیے مثالی

زندگی ہے۔ آپ بادشاہوں اور جرنیلوں اور ججوں کے لیے بھی نمونہ ہیں۔ شوہروں، باپوں اور بیٹوں کے لیے بھی نمونہ، تاجروں اور معلموں اور زاہدوں کے لیے بھی آپؐ کی زندگی میں ہدایت ہے اور امیروں، غریبوں اور درویشوں کے لیے بھی اسوۂ کاملہ۔ انسان کسی پیشہ اور کسی استعداد کا ہو بشرطیکہ وہ انسان ہو حضورؐ کی پاک زندگی میں اس کے لیے کامل رہنمائی پائی جاتی ہے۔ اس کمال راہنمائی کا اثر دیکھنا ہو تو صحابہ کی زندگی میں دیکھیے۔ یہاں بہترین سپہ سالار اور جرنیل اور حکمران و مدبر بھی آپ کو مل جائیں گے اور زاہد، عابد، فقیر، درویش متوکل علی اللہ افراد بھی، یہاں آپ کو علماء و فضلا اور تجار اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والی بہترین انسانی ہستیاں نظر آجائیں گی ـــ ان ہستیوں کو دیکھیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجیے کہ ـــــ

جب اس آفتاب کی کرنوں میں اتنی درخشندگی و تابندگی ہے تو پھر خود اس آفتاب کی نورانیت کا کیا عالم ہوگا ـــــ!!

باب چہارم

رسولؐ کی محبت، اطاعت اور پیروئ سنت

- محبتِ رسولؐ
- اطاعتِ رسولؐ
- سنتِ رسولؐ

محبّتِ رسُولؐ

جس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے اور اطاعت کے بغیر محبّتِ رسُولؐ معتبر قرار نہیں پاتی۔ اسی طرح اطاعت بھی اس وقت تک قبول نہیں ہے جب تک اس میں محبت شامل نہ ہو —— یہی وجہ ہے کہ عارفانِ شریعت نے "اطاعت کے بغیر محبت" اور "محبّت کے بغیر اطاعت" —— ہر دو صورتوں کو بدعت قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص حضورؐ کی محبّت کا دم بھرتا ہے لیکن آپؐ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا تو کوئی بھی معقول آدمی اس کے دعوئ محبت کو سچّا نہیں سمجھے گا۔ عشق کا اوّلین تقاضا ہی یہ ہے کہ محبوب کے ہر اشارۂ ابرو پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے ؎

عاشقی چیست؟ بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

اور اسی طرح اگر کوئی شخص اطاعت میں تو بڑی سرگرمی دکھاتا ہے لیکن اس کا دل عشق و محبّت کے جذبات سے خالی ہے تو یہ ایسی بات ہو گی جیسے ایک چھلکے سے مغز نکال کر اسے بیکار کر دیا جائے وُہ اصحاب فہم و بصیرت جو "محبّت کے بغیر اطاعت" کو منافقت گردانتے ہیں غور کیا جائے تو ان کا نظریہ بڑی حد تک صحیح نظر آتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی خارجی دباؤ کے تحت مطیع و فرمانبردار بنا رہتا ہے لیکن دراصل اس کے داخل میں خوئے تسلیم و رضا کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ جونہی وہ بیرونی دباؤ ختم ہوتا ہے تسلیم و انقیاد کی بجائے طبیعت پھر سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے اسی لیے اسلام میں اطاعتِ رسُولؐ کے ساتھ ساتھ محبّتِ رسُولؐ پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ خود حضورؐ نے فرمایا:

"تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے
اپنے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں"۔

بیٹے اور باپ کی محبت تقاضائے طبیعت ہے لیکن حضورؐ کی محبّت عقل و وجدان کی طلب ہے۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا کہ کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ اور عقلی تقاضے طبعی تقاضوں پر تب غالب آتے ہیں۔ جب یہ جذبات میں رچ بس کر خود انسان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں اور رگ و پے میں خون بن کر گردش کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محض ظاہر میں سر کا جھکاؤ ہی نہیں چاہتی بلکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے غایت درجہ

کے جذباتی لگاؤ کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں:

كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ اٰخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَاَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّا مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى اَكُوْنَ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ عُمَرُ فَاِنَّكَ الْاٰنَ وَاللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ اَلْاٰنَ يَا عُمَرُ۔

یعنی ہم آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تھے، آپ عمر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا یارسول اللہؐ آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، آپؐ نے فرمایا۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک میں تم کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں تم مومن نہیں ہو گے۔ پس عمرؓ نے کہا پس اب آپ مجھے بخدا اپنی ذات سے بھی زیادہ پیارے ہو گئے۔ پس آپؐ نے فرمایا۔ ہاں اب اے عمر (تم ٹھیک ہو گئے ہو)

اسی محبت آمیز تنبیہہ کا اثر تھا کہ اسے سنتے ہی حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا کہ:

"اب آپ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔"

یہ محبت اتنی بڑھی کہ تاریخ بتاتی ہے کہ رسول پاکؐ کی وفات کے بعد

جب حضرت عمرؓ کو رسُول پاکؐ کا زمانہ یاد آتا تو رونے لگتے اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتے۔ یہی حضرت عمرؓ تھے کہ تنخواہوں کے تقرر کے وقت ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے ان سے شکایت کی۔ "ابا جان یہ میری تنخواہ تھوڑی اور حضرت اُسامہ کی زیادہ ہے حالانکہ میں ان سے کسی معاملے میں پیچھے نہیں ہوں" تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

لِاَنَّ زَیدًا کَانَ اَحَبُّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اَبِیْکَ وَکَانَ اُسَامَۃُ اَحَبُّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْکَ۔

"بیٹا! رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو (اسامہ کے والد) حضرت زید تیرے والد سے زیادہ پیارے تھے اور خود اسامہ تجھ سے پیارے تھے۔"

معلوم ہُوا کہ محبّت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ محبوب جس چیز سے محبّت رکھتا ہو۔اس سے محبّت کی جائے۔یہی وہ اصول ہے جو ہمیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں حضورؐ نے اہل بیت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا:

"اے اللہ مَیں ان سے محبّت رکھتا ہوں تُو بھی ان سے محبّت فرما اور جو ان سے محبّت کریں ان سے بھی محبّت فرما۔"

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

"عرب سے محبّت رکھو اس لیے کہ مَیں عربی ہوں" اور یہ کہ "عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگو گے۔" (ترمذی)

وہ لوگ جو اسلام کو یبوست اور خشک مزاجی کا علمبردار بنائے ہوئے ہیں اور محبتِ رسولؐ کو دین و ایمان کا حصہ نہیں سمجھتے، انھیں صحابہ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ دیکھیں گے کہ محبت اور انتہائی وارفتگی کے جو مناظر یہاں پائے جاتے ہیں وہ چشمِ فلک نے شاید ہی کہیں اور دیکھے ہوں۔

جنگ اُحد کا واقعہ ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر ایک شخص زخموں سے چور کراہ رہا ہے۔ آپ اس کے پاس پہنچیں، پانی پلایا، سانس اُکھڑ رہی تھی، لیکن اُمّ المؤمنینؓ نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا:

"اللہ کے رسولؐ ـــــ ان پر خُدا کی رحمتیں ہوں! کاش ان کو یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ ان کا غلام زیاد دُنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔"

اُمّ المؤمنینؓ بارگاہ رسالت میں پہنچیں، زیادؓ کا پیغام دیا، آپؐ بے قرار ہو کر تشریف لائے۔ آتے ہی فرمایا۔ "زیاد آنکھیں کھولو! دیکھو میں آگیا ہوں"۔ زیادؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ حضورؐ نے پوچھا۔ "زیاد کوئی آخری تمنا؟" اور زیادؓ نے عرض کیا "حضور! صرف ایک تمنا ہے۔" اور انھوں نے جسم کو آگے گھسیٹ کر اپنا سر حضورؐ کے قدموں پر رکھ دیا۔ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔

رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا۔

"اللہ تعالےٰ سے رب ہونے کے باعث اور اسلام سے دین کے

طور پر اور محمدؐ سے نبی کی حیثیت سے راضی ہوں۔"

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک آدمی مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر اطاعت میں کامل نہیں ہوتا۔ اس سے کبھی کبھی گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ اس کے دل میں اللہ اور رسولؐ کی محبّت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ راندۂ درگاہ نہیں ہونے پاتا۔ اور گناہوں کے باوجود اس کی طرف اسلام کی چشم التفات قائم رہتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ راوی ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں عبداللہ نامی ایک شخص تھا جس کا لقب حمار تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ شراب نوشی کی وجہ سے اسے کوڑے بھی لگ چکے تھے ایک دن پھر اسی الزام میں پکڑا ہُوا آیا۔ حضورؐ نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اسے کوڑے لگ چکے، تو ایک شخص کہنے لگا۔ اے خدا! یہ بار بار شراب پینے کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے، اس پر لعنت فرما! حضورؐ نے سُنا تو فرمایا:

لَا تَلْعَنُوْهُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اِلَّا اَنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

اس پر لعنت مت برساؤ! بخدا مَیں جانتا ہوں کہ یہ خُدا اور اس کے رسُول سے محبّت رکھتا ہے۔

اس واقعہ سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض اطاعت ہی کا تعلق جوڑنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں آپ کے لیے محبّت کے لطیف جذبات بھی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور اسے یہ بھی مطلوب ہے کہ حضورؐ کا نام آنے پر صدیق اکبرؓ کی

طرح دلوں میں ہلچل پیدا ہو جائے اور آنکھیں وفورِ جذبات سے بھیگ بھیگ جائیں۔

وہ لوگ جو زاہد خشک تو بن گئے ہیں لیکن محبتِ رسولؐ کی اس دولت سے محروم ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ ان واقعات کی تاویل کرنے کی بجائے اس مقامِ محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ع

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

اطاعتِ رسولؐ

اِس ظلمت کدۂ عالم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے انبیاءؑ تشریف لائے ہیں ان کی حیثیت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہم تک مالکِ کائنات کا حکم پہنچا دیا اور بس، بلکہ قرآن شہادت دیتا ہے کہ ان کے بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں اور اس اطاعت کے ذریعے خدا کی رضا حاصل کریں۔ قرآن نے کہا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ "ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں اس لیے بھیجے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے اور یہ اللہ کی اذن سے ہے۔" اسی مضمون کو ایک اور اسلوب سے یوں بیان فرمایا ہے:

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔" (النساء ۸)

اور اس اطاعت کی بھی تشریح فرمادی کہ یہ اطاعت ایسی ہو جس میں اخلاص و انقیاد اور تسلیم و رضا کی تمام خصوصیتیں موجود ہوں۔ یہاں تک کہ تنبیہہ کر دی کہ اگر اطاعتِ رسولؐ میں ذرا برابر بھی دل کی تنگی پائی گئی تو یہ ایمان کے فقدان کی علامت ہو گی۔ سورۂ نساء میں کہا گیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

پس قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ایسا نہ ہو کہ وہ آپس کے تمام جھگڑوں میں آپ کو حکم بنائیں پھر جو فیصلہ آپ فرمادیں اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اپنے آپ کو بالکل حوالہ کر دیں۔

پھر اس اطاعت کو صرف زندگی کے اہم معاملات تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی رسولؐ کی اطاعت کی جائے، اجازت لے کر رخصت ہونا یا بلا اجازت چلے جانا یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے لیکن اگر کسی اجتماعی کام میں شرکت کرنے کے بعد رسولؐ کی اجازت لیے بغیر کوئی شخص رخصت ہو جائے تو یہی بات شرائط ایمان کی خلاف ورزی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے بتایا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى

يَسْتَاذِنُوْهُ ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

مومن تو اصل میں وہی ہے جو اللہ اور رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسُول کے ماننے والے ہیں۔

جنّت میں کون داخل ہوگا ، اور کون نہیں ، حضورؐ نے خود اس کو واضح فرمایا اور بتا دیا کہ جو لوگ میری اطاعت کریں گے۔ وہی جنّت میں داخل ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا :

كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَبٰى قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى۔ (بخاری)

یعنی میری اُمّت کے تمام افراد جنّت میں داخل ہوں گے بجز ان کے جو میرا انکار کریں گے۔ پوچھا گیا۔ آپ کا انکار کرنے والے کون ہیں ؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے وہی میرا انکار کرنے والا ہے۔

اندازہ کیجیے یہی نہیں کہ اطاعت کرنے والوں کو جنّت میں داخل ہونے کا مُژدہ سنایا جا رہا ہے بلکہ وہ لوگ جو آپؐ کو پیغمبر مان کر حلقۂ اطاعت سے باہر نکلے ہیں۔ ان کو مُنکرِ رسالت قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف

معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کو ماننا اس طرح کا ماننا نہیں جس طرح ہم کسی تاریخی شخصیت کو تسلیم کرتے ہیں یا محض کسی کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں بلکہ یہ وہ "ماننا" ہے جس کے لیے اطاعت شرطِ اوّل کا حکم رکھتی ہے اور اسی وجہ سے قرآن نے اعلان کیا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ ٥ (آل عمران)

ان لوگوں سے یہ کہہ دیجیے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم کو میری پیروی کرنی چاہیے۔ اللہ تم سے محبت فرمانے لگے گا۔ اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

عبادت کتنا پسندیدہ فعل ہے؟ یہاں تک کہ اسے جن و انس کی پیدائش کا مقصد اوّلین بتایا گیا ہے مگر یہی عبادت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے ہٹ کر کی جاتی ہے تو ناپسندیدہ قرار پاتی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ تین صحابیؓ ام المؤمنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی عبادت کا حال پوچھا۔ جب تفصیل بیان کی گئی تو وہ اسے اپنے حق میں کچھ کم سمجھے اور کہنے لگے کہ آپؐ تو معصوم ہیں پھر آپ کا اور ہمارا کیا مقابلہ؟ ان میں سے ایک نے کہا "میں تو ہمیشہ تمام رات نماز پڑھوں گا۔" دوسرے نے کہا۔ "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔" تیسرے نے کہا۔ "میں کبھی نکاح نہیں کروں گا۔" ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ اس اثنا میں آنحضورؐ تشریف لے آئے۔ آپؐ نے فرمایا "تم لوگ ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے تو لو

سُن لو! تم سب میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا مَیں ہُوں اور تم سب سے بڑھ کر متقی مَیں ہوں مَیں تو روزہ بھی رکھوں گا اور افطار بھی کروں گا۔ شب میں نماز بھی پڑھوں گا۔ اور سوؤں گا بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کروں گا۔ اب جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہ ہو گا۔" (متفق علیہ)

اندازہ کیجیے شریعت میں اطاعتِ رسُولؐ کا مقام کتنا اعلیٰ و ارفع ہے؟ یہاں صرف شوق عبادت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور محبّت الٰہی سے سرشار ہو کر فقر و درویشی کے عہد کیے جا رہے ہیں لیکن فقط اس لیے ان کے نماز روزہ اور مراسم بندگی کو نامناسب قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبادت آپ ہی کی اطاعت اور آپ ہی کی اتبّاع ہے جو شخص اس معاملے میں جتنا آگے ہو گا۔ اتنا ہی زاہد و عابد اور خُدا کا محبوب و مقرّب ہو گا۔ بات صاف نہ ہوئی ہو تو ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں اس سے بندگی اور عبادت کی اصلیت سامنے آجائے گی واقعہ یہ ہے (حضرت جابرؓ اس کے راوی ہیں) کہ ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم رمضان المبارک میں سفر کے لیے نکلے اور آپؐ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا۔ جب "کراع الغنیم" کے مقام پر پہنچے تو آپؐ نے ایک پیالہ میں پانی منگایا اور اپنے ہاتھ میں اس کو اتنا اونچا اٹھایا کہ سب لوگوں نے دیکھ لیا اور اس سے آپؐ نے افطار کر لیا۔ جب افطار ہو چکا تو آپؐ کو اطلاع موصول ہُوئی

بعض لوگ تو اب بھی روزہ دار ہیں تو حضور نے فرمایا :

" یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں ۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں"۔ (مسلم)

دیکھیے ! اس واقعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ عبادت سراسر آپؐ کی پیروی کا نام ہے ۔ آپؐ کے اتباع میں روزہ رکھا جائے تو عبادت اور آپؐ کے اتباع میں روزہ توڑ دیا جائے تو بھی عبادت ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزہ توڑنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص روزہ پورا کر لیتا ہے تو بظاہر کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا ثواب ملنے کا گمان ہوتا ہے لیکن اسلام نے اتنی سی بات کو بھی گوارا نہیں کیا اور صاف اعلان کر دیا کہ یہ زہد و اتقا نہیں ، بلکہ خدا کی نافرمانی ہے ۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا ؎

بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر با و نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسلام میں اطاعتِ رسولؐ کتنی اہمیت رکھتی ہے ؟ اسے معلوم کرنا ہو تو صحابہؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے ۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ سے قرآن کے مخاطبین اوّل نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے سانچے میں ڈھال دو ۔ وہ جس بات کے کرنے کا حکم دیں اسے کرو اور جس سے رُکنے کا فرمائیں اس سے رُک جاؤ ۔ وہ قرآن کے اس فرمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے کہ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ رسول اللہ تمھیں جو دیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ ۔ یہ علم دین کی رازدار ہستیاں یہی

نہیں کہ اوامر و نواہی میں حضورؐ کی اطاعت کو فرض سمجھتی تھیں، بلکہ آپؐ کی ایک ایک ادا کا اتباع ان کے لیے سرمایۂ حیات تھا۔

حضرت عمارہؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ وہ منبر پر خطبہ میں اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے فرمایا خدا تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کا ناس کرے کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا تو اپنے ہاتھ کی صرف شہادت کی انگلی اٹھاتے تھے۔ (مسلم)

بات بظاہر چھوٹی سی ہے کہ منبر پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اُٹھائے جائیں یا صرف ایک انگلی۔ مگر جب صحابی کی نظر سے آنحضورؐ کی ایک ادا گزر چکی تھی تو اس نے پسند نہ کیا کہ اس کے خلاف عمل کیا جائے اور یہ صرف حضرت عمارہؓ ہی پر موقوف نہیں خلفائے راشدینؓ تک اگر کبھی اپنی پسند اور ناپسند کو ذوقِ رسولؐ سے ہٹا ہوا پاتے تو بے قرار ہو ہو جاتے۔

امام شعرانیؒ نے حضرت فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت کا ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو اطلاع ملی کہ بعض کپڑے بول عجاز سے رنگے جاتے ہیں ــــ بول عجاز پتوں سے بنا ہوا ایک خاص قسم کا رنگ تھا۔ تو آپ نے ایسے کپڑے اتار دینے کا حکم جاری کرنے کا ارادہ کیا۔

وجہِ ناپسندیدگی یہ تھی کہ بول عجاز عربی میں اونٹنی کے پیشاب کو کہتے ہیں لیکن جب آپ کو دوسرے صحابہؓ کے ذریعے معلوم ہوا کہ بول عجاز میں رنگے ہوئے کپڑے خود جناب رسالت مآبؐ نے پہنے ہیں تو آپ فوراً اپنے اس

ارادہ سے باز آگئے اور اپنے پہلے ارادہ کو فسخ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر بار بار استغفار کیا۔

شریعت کھانے پینے کے دائرے میں حلال و حرام کا تعین کر کے انسان کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ وہ حلال چیزوں میں سے جس چیز کو چاہے کھائے پیئے مگر صحابہؓ کا ذوق اطاعت اتنا بڑھا ہُوا تھا کہ اگر انھیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے فلاں کھانے کی چیز کو پسند کیا ہے تو اس کے بعد انھیں بھی وہ چیز مرغوب ہو جاتی حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضورؐ کے لیے کچھ کھانا تیار کیا اور آپ کی دعوت کی۔ مَیں بھی حضورؐ کے ہمراہ تھا۔ صاحب خانہ نے جَو کی روٹی کے ساتھ جو شوربا پیش کیا۔ اس میں لوکی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے مَیں نے دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم لوکی کے ٹکڑے پیالے میں چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں۔ بس اس دن سے لوکی مجھے محبوب ہو گئی۔ اور اس کے بعد جس سالن میں بھی لوکی ڈلوا سکتا تھا ضرور ڈلواتا۔

آپ لوکی کھائیں یا نہ کھائیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا مگر حضرت انسؓ کو دیکھیے کہ اطاعتِ رسُولؐ کا شوق انھیں کہاں تک لے گیا حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ حضورؐ کی اطاعت میں بالکل متفق و یک رائے تھے۔

سُنّتِ رسُولؐ

آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو جگہ جگہ آپ کو ایسے مقامات نظر آئیں گے جہاں صرف مجمل حکم جاری کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی گئی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے بنیادی مسائل تک کے متعلق جن پر اسلام کا دارومدار ہے۔ کتابِ پاک میں مجمل احکام کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ نماز کی رکعتیں۔ اس کی ادائیگی کے طریقے۔ اسی طرح زکوٰۃ اس کا نصاب اور روزہ اور حج کی دوسری تفاصیل یہ ساری کی ساری باتیں ہمیں قرآن سے نہیں ارشاداتِ رسُولؐ سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کو رسول اللہ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ ان کے اقوال و افعال سے روشنی حاصل کیے بغیر تعلیماتِ قرآنی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ ربانی ہے۔

"کہہ دو (اے پیغمبر) اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبّت کرے گا۔" (آل عمران۔۳۱)

یہ بھی بتا دیا گیا کہ رسُول خداؐ کے فرائض منصبی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ قرآن کی وضاحت اور تبیین فرمائیں، ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم نے تیری طرف 'الذکر' نازل کیا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو واضح کرے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔" (النحل)

اس تبیین و توضیح کے بغیر اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ قرآن کو سمجھ لے اور اس کے جملہ احکام کی پیروی کرے تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے کسی بچے کو معلّم اور اتالیق کے بغیر از خود کتابیں پڑھنے پر لگا دیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ جیسے فاضل روزگار کا قول ہے۔

"اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا۔"

قرآن، خاکم بدہن اگر شاعری کی کتاب ہوتا، تو یہ بات اس کے محاسن میں شمار ہوتی کہ پیغمبر اس کی تشریح خود قارئین پر چھوڑ دے اور وہ اس کے بطن سے رنگا رنگ معانی برآمد کر لیں مگر جس قرآن نے افتراق و انتشار کو ختم کرنے اور اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامنے کا حکم دیا ہو اس کے احکام کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ خُداؐ کی قولی و عملی تشریحات کو چھوڑ کر ہم اپنی رائے سے ان کا مفہوم متعین کرنے بیٹھ جائیں اور اس طرح اسے "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مصداق بنا کر رکھ دیں۔ آج مسلمانوں میں جتنی چیزیں متفق علیہ ہیں۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سُنتِ رسُولؐ سے اسلام اور قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر آغازِ اسلام سے لے کر اب تک مسلمان سُنّت نبوی سے بے نیاز رہتے تو ان کے درمیان

شاید ہی کوئی قدرِ مشترک باقی رہتی۔ آج صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، [illegible] اور دوسری بے شمار اسلامی اصطلاحات سنتے ہی فی الفور ان کا ایک متعین مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

یوں بھی انسان کی فطرت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہو یا جس کی عظمت اور برتری کا قائل ہو اس کی اداؤں اور اس کی باتوں کو دل سے محو نہیں ہونے دیتا۔ جنھیں اس دَور میں اقبال اور قائدِ اعظم مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ آپ کبھی ان سے بات کریں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ان مرحوم اکابر سے سنی ہوئی ایک ایک بات کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کی گفت گو کا انداز، لباس وضع قطع ہر چیز ان کے دماغ میں محفوظ ہے۔ اخبارات و رسائل ان بزرگوں کی یاد میں نمبر نکالتے ہیں تو ان لوگوں کے خیالات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور قارئین ان چشم دیدہ واقعات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ اعاظمِ رجال کی باتیں ہم کیوں نہیں بھولتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہوتی ہے اور ہم ان کی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کو احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی حال محبت کرنے والوں کا ہے انھیں محبوب کی ایک ایک ادا متاعِ گراں بہا معلوم ہوتی ہے۔ وہ ان باتوں کو بھلانا چاہیں تب بھی اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ع

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وُہ اکثر یاد آتے ہیں

انسانی فطرت کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر اب ذرا ایک لحظہ

کے لیے صحابۂ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر غور کیجیے جو شخصیت "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کا مقام رکھتی ہو۔ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے؟ دُنیا نے احترام و عقیدت کے یہ انسانی مناظر کاہے کو دیکھے ہوں گے کہ اسامہؓ بن شریک فرماتے ہیں کہ :

"میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا، کیا دیکھتا ہوں کہ آپؐ کے صحابہؓ آپؐ کے ارد گرد اس طرح بے حس و حرکت خاموش بیٹھے ہیں گویا ان کے سروں پر کوئی پرندہ گھوم رہا ہے۔" (ترمذی)

صحابہؓ کے دِلوں میں عظمتِ رسُولؐ کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا ہو تو اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں :

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حجام آپؐ کا سر مونڈ رہا ہے۔ صحابہؓ آپؐ کو گھیرے ہُوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ جو بال آپ کے سرِ مبارک سے گرے وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔" (مسلم)

یہی وہ احساسِ عظمت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر کے سامنے اونچی آواز سے بولنے کو منع فرما دیا تو ایک صحابی ثابت بن قیسؓ اپنے گھر بیٹھ رہے اور آپؐ کی خدمت میں آنا جانا بند کر دیا۔ آپ نے سعد بن معاذؓ سے اُن کا حال پُوچھا وہ حضرت ثابتؓ کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کا حال ان سے بیان کیا۔ ثابتؓ بولے کہ :

"اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت نازل ہو چکی ہے اور

تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے تو مجھے ڈر یہ ہے کہ میں کہیں دوزخی نہ ہو جاؤں۔"

یہ تو صحابہ کرامؓ کے دلوں میں دُنیا کے اس سب سے بڑے انسان کی عظمت کا عالم تھا۔ محبت کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہوتا کہ عشق و محبت کی جو لافانی مثالیں ہمیں یہاں نظر آتی ہیں تاریخ کے صفحات ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں — عروہ بن مسعود ثقفی ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے سفیر بن کر آئے۔ واپس گئے تو قریش کے سامنے صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

"لوگو! خُدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا ہے۔ قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے سامنے حاضر ہُوا ہوں۔ قسم خُدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں۔ قسم خُدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں پھر وہ اپنے چہرہ اور بدن پر اسے مَل لیتا ہے۔ محمدؐ جب کسی بات کا انھیں حکم دیتے ہیں تو اس کی تعمیل کی طرف جھپٹ پڑتے ہیں۔ جب محمدؐ بات کرتے ہیں تو اُن کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی

وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔" (بخاری)

حضرت عبداللہ بن زیدؓ جو صاحب الاذان کہے جاتے تھے اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ انھیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحلت کی خبر معلوم ہوئی۔ اسی وقت انھوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور کہا "اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔"

یہ رسول اللہؐ سے صحابہؓ کے تعلق کی چند جھلکیاں ہیں۔ جو اصحاب تفصیلات چاہتے ہوں وہ احادیث وسیر کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیں۔ انھیں معلوم ہوگا کہ حضورؐ اپنے متّبعین کی نظر میں کتنے محبوب اور کتنے باکمال وصاحبِ عظمت تھے ــــ اس تعلّق کو پیشِ نظر رکھیے اور اس کے بعد انصاف سے کہیے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ صحابہؓ اپنے محبوب و عظیم رہنما کو قریب سے دیکھتے، ان کے ارشادات سُنتے اور پھر ان ساری باتوں کو بھلا دیتے؟ جو شخص ہمارے سامنے یہ عجیب و غریب اور مضحکہ انگیز خیال پیش کرتا ہے اس کے بے عقل اور بے مغز ہونے میں کیا کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہی نہیں کہ آپؐ کے تذکروں میں صرف صحابہؓ کا داخلی احساس کارفرما ہے بلکہ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تاکید فرمائی۔

"ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمھارے پیچھے ہیں انھیں ان سے مطلع کرتے رہنا۔"

اسی پر بس نہیں۔ حضورؐ منیٰ کے میدان میں ایک لاکھ صحابہؓ کے مجمع کو خطاب فرماتے ہیں، اور انھیں یاد دلاتے ہیں:

"تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سُنی
پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سُنا ہے اس تک اسے پہنچا دیا۔"
اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب داخلی احساس عظمت و محبّت کے
ساتھ ساتھ خارج سے اس عظیم محبوب شخصیت کی یہ تاکید بھی شامل ہو گئی
ہو گی تو صحابہؓ نے کس ذوق و شوق سے احادیثِ رسولؐ کی اشاعت کی ہو
گی۔ اشاعتِ حدیث کے نتیجے میں طلبِ حدیث کی پیاس کا پیدا ہونا ایک
قدرتی امر تھا اور طلب حدیث کا یہی وہ ذوق و شوق ہے جس کی ایک مثال
خود حضرت عبداللہ بن عباس نے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"مَیں حدیث کی طلب میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا۔
جس کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم
سے کچھ سُنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں تو اپنی
چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا۔ ہوائیں دُھول اُڑا
اُڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں اور مَیں اسی حال میں پڑا رہتا تا آں کہ
خود وہ صاحب باہر نکل آتے، باہر نکل کر جب وہ مجھے دیکھتے تو
کہتے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عم زادے! آپ کیسے تشریف
لائے ہیں۔ مَیں کہتا کہ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ حضورؐ سے تم کوئی حدیث
بیان کرتے ہو۔ مَیں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں۔ جواب
میں وہ صاحب کہتے۔ آپ نے کسی کو بھیج دیا ہوتا۔ مَیں خود
حاضر ہو جاتا۔ مَیں کہتا کہ تمھارے پاس حاضر ہونے کا مستحق مَیں ہُوں۔"
(دارمی)

باب پنجم

میلاد کی تقاریب، ہمارا عمل اور فرائض

- تربیتِ عمل کے آغاز کی ضرورت
- عید میلاد اور آدابِ محفل سے لاپرواہی
- ایک توجہ طلب سوال
- آؤ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھیں

تربیت عمل کے آغاز کی ضرورت

(حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمارے لیے ہر پہلو سے اہم ہے اور اس مبارک اور مسعود زندگی کا کوئی ایک گوشہ ایسا نہیں جس کے ساتھ محبّت و عقیدت کا اظہار کیے بغیر اور اس محبّت و عقیدت میں اپنے آپ کو سرتاپا گم کر دینے کے بغیر ہم اپنی دُنیا اور اپنے دین کو مکمل سمجھیں اور اپنی آدمیت کی تکمیل کا دعویٰ کر سکیں۔ ہمارا دین اسی جامع صفات زندگی کے مختلف گوشوں سے عبارت ہے اور اگر اس میں سے کوئی ایک خفیف سے خفیف اور معمولی سے معمولی گوشہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو ہمارے دین میں کمی آجاتی ہے اور ہمیں اپنی عاقبت کے متعلق خطرات محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح دُنیوی زندگی کے لیے اس عظیم اور یقیناً بے مثال زندگی میں ایسی لاتعداد ایمان افروز اور بصیرت افروز مثالیں موجود ہیں جن کی پیروی کیے بغیر ہماری دُنیوی زندگی میں محسوس

خلا پیدا ہونے لگتے ہیں اور ہماری زندگی ہماری ان کوتاہیوں کے نتائج کو فوراً محسوس کرنے لگتی ہے۔ گویا دین ہو یا دُنیا رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی وہ لنگر ہے جو انسانی زندگی کی کشتی کی ان دونوں اطراف کو تھامے ہوئے ہے اور اس لنگر کے استعمال میں جہاں کہیں اور جب کبھی ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی اور ہماری بے بضاعتی ہم پر غالب آئی، کشتی ڈولنے لگی اور اس سے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان ہوئے۔)

(سیرتِ مبارکہ کی یہ اہمیت کسی دَور میں مسلمانوں کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی اور مسلمان قوم نے ہر زمانے میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کو سمجھنے، اس کا مطالعہ کرنے اور اس سے اپنے راستے کے اندھیروں کو اجالنے میں مسلسل اور پیہم جدوجہد کی۔ اس اہم اور ضروری کام کا یہ نتیجہ ہے کہ دُنیا کی کسی تاریخ یا قبل از تاریخ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر لکھی گئی ہیں۔ لٹریچر کی ایک ندی رواں ہے جو نہیں رکتی اور مسلسل رواں دواں ہے۔ دُنیا کی وہ بہت ہی بدقسمت زبان ہو گی جس میں سیرتِ رسُولؐ پر کچھ نہ لکھا گیا ہو اور وہ نہایت غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب انسانی گروہ ہو گا جس نے عالمِ انسانی کی عظیم ترین اور ہر لحاظ سے تاریخی شخصیت کے عمل و کردار کو سمجھنے اور حسبِ استطاعت اس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔)

(یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسا ہُوا اور یہ عالم انسانی کے لیے اُمید

کا وہ واحد مینارۂ نور ہے جو آنے والی صدیوں میں انسان کے بے لنگر جہاز کو ساحلِ مُراد کی طرف لے جانے کی واحد ضمانت ہو گا۔

یہ مبارک مہینہ اس عظیم الشّان اور بے مثال شخصیت کی ولادت باسعادت کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں پاکستانی مسلمانوں کے علاوہ دُنیا کے تمام مسلمان گروہ اس شخصیت کو سمجھنے اور اس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے مُلکوں سے نہیں ہمارا خطاب اہلِ وطن سے ہے۔ ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا پچھلے سال اس مہینے میں جو کچھ ہُوا ▪ اس فقید المثال شخصیت کے شایانِ شان تھا اور جو کچھ اس سلسلہ میں کیا گیا ہے اسے کافی سمجھا جائے گا؟

جو کچھ ہُوا اس کی فہرست کچھ زیادہ طویل نہیں، جلوس نکلے ہلڑبازی ہوئی اور اظہارِ شادمانی اور محبت میں ہم نے اس عظیم موقع کو میلہ بنا کر کھو دیا۔ اس کے علاوہ کچھ جلسے ہُوئے، نشستیں ہوئیں اور تقریریں ہُوئیں۔ ان تقریروں میں بعض علماء نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ بعض بڑے حسین پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی، لیکن ان ساری کوششوں اور ان پُر خلوص کاموں کا نتیجہ کیا ہے۔

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے اور تربیتِ فکر، تربیتِ عمل کی طرف پہلا قدم ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کب تک اپنے آپ کو تربیتِ فکر تک محدود رکھیں گے اور تربیتِ عمل کے دن کے طلوع کا انتظار کب تک ہو گا؟ کب تک رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات محبت اور علم کی باہمی آویزش کا نقطہ بنی رہے گی اور ہم یہ باتیں کب تک سنتے رہیں گے کہ فلاں گروہ اس لیے کافر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت نہیں رکھتا جتنی محبت کا اظہار معترض گروہ کرتا ہے، اور فلاں گروہ اس لیے گردن زدنی ہے کہ وہ محبت محبت میں بدعتی ہو گیا ہے۔ مختصر لفظوں میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور اسم گرامی کو کب تک اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ اور عوام کالانعام کے خلوص و عقیدت کا استحصال کب تک ہوتا رہے گا؟

بدنصیبی کی شبِ تار کی صبح اب طلوع ہونی چاہیے اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ محبت کے جذبے کو مابہ النزاع بنانے کے بجائے اس جذبے کی صحیح عظمت کو محسوس کر کے اس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

عید میلاد اور آدابِ محفل سے لاپرواہی

بعض افسوسناک اور انتہائی طور پر قابلِ مذمت رجحانات کے اظہار نے عید میلاد کی طہارت و عظمت کو بے داغ نہیں رہنے دیا۔ لیکن اس کا نوٹس لینے اور اسے خاص طور پر نشان زد کرنے کے بعد یہ بات شکر و اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت کو کتمِ عدم سے منصّۂ شہود پر آنے والے کے شایانِ شان منانے کی پوری کوشش کی گئی۔ یہ شان بہت اونچی ہے اور اس کی گردِ پا تک پہنچ جانے کی سعادت حاصل کر لینا اتنا کٹھن راستہ ہے کہ بڑے بڑے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس صورت حال میں ہم عاصی شفاعت کے طلب گار اور اُمیدوار یہ دعویٰ کس زبان سے کر سکتے ہیں کہ ہم بہت پیچھے رہ گئے اور ہماری کوششیں بار آور نہ ہو سکیں تاہم ہم نے کوشش ضرور کی ہے اور اس اُمید کے ساتھ کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے دربار میں سب کو بار ہے۔ شاید ہماری یہ

داغ داغ کوششیں ہی شرفِ قبول کو پہنچ جائیں۔ یقین ہے کہ حضور رسالت پناہی میں ہماری لاج رکھ لی جائے گی اور شرمساروں کو دامانِ رحمت میں پناہ مل جائے گی۔ اس سلسلے میں بعض معروضات کی طرف خاص طور پر توجّہ دلانا ضروری ہے۔

ہر محفل کے کچھ آداب ہوتے ہیں اور ان آداب کا ملحوظ رہنا صرف مستحسن ہی نہیں بلکہ شرکاء اور انجمن دونوں کے لیے ضروری بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم کسی تفریح گاہ میں جائیں اور وہاں پہنچ کر صمٌ بکمٌ بن کر بیٹھ جائیں تو ہم دوسرے شرکاء کے لیے مسئلہ بن جائیں گے۔ اسی طرح عام خوشی کی تقریب میں شامل ہونے کے کچھ آداب اور آزادیاں ہوتی ہیں۔ گپ شپ، قہقہے، لطیفہ بازی وغیرہ، اس محفل کے آداب میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ لیکن تفریح گاہ کے مقابلے میں اس پر کچھ پابندیاں عاید ہوتی ہیں۔ گھر اور سنیما ہال کا فرق بہر حال ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، ٹھیک اسی طرح جب ہم کسی بڑے آدمی کی محفل میں شامل ہوں تو یہ پابندیاں کچھ زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں لطیفہ بازی میں ایک ٹھہراؤ، گپ شپ میں ایک خاص متانت اور حفظِ مراتب کا خاص اہتمام فرض قرار پاتا ہے، اور اس فرض کی بجا آوری میں کوتاہی نامعقولیت سمجھی جاتی ہے، اس کو ذرا آگے بڑھائیے اور ذرا یہ سوچیے کہ جب محفل ایسی ہو جس میں کوئی نہایت ہی معزّز مہمان تشریف لایا ہو تو اظہارِ مسرت و شادمانی پر حدود و قیود کس درجے پر پہنچیں گے اور محفل کا رنگ کیا ہو گا؟

اس قیاس کو ذہن میں رکھ کر یہ اندازہ کرنا شاید مشکل نہ ہو کہ جب محفل سرورِ دوجہاں صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نامِ نامی اور اسمِ گرامی کے زیرِ سایہ منعقد ہو رہی ہو اور مقصد یہ ہو کہ دُنیا کے عظیم ترین انسان کو خراجِ عقیدت و احترام پیش کرنا ہے ایسے افضل البشر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذکرِ جمیل سے دل وجان کو تازہ کرنا ہے جو محض عقیدت مندوں کے زور پر افضل البشر نہیں بلکہ جو تاریخ کی تیز ترین روشنی میں موجود ہے اور ہر پہلو سے افضل البشر صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ ایسی محفل پر کیا حدود و قیود ہوں گے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا چاہیے اور اخلاق کے کن دائروں میں اپنے آپ کو محدود کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے ایسی محفلوں کا انعقاد کرتے وقت ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہم ایک بہت بڑی ذمّہ داری اُٹھا رہے ہیں۔ یہ دین و دُنیا اور اس زندگی اور عقبیٰ کی زندگی کا سوال بن جاتا ہے جس کی طرف توجّہ دیے بغیر ہمیں اس ذمّہ داری کو قبول کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

اخباری رپورٹروں اور رپورتاژوں کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم میں سے اکثر نے اس عظیم ذمّہ داری کے پورے احساس کے بغیر اپنے آپ کو اس ذمّہ داری کا اہل سمجھ لیا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ اتنی بڑی اور عظیم محفل میلہ بن کر رہ گئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی یقیناً کمی نہیں رہی جنھوں نے اس کام کی جُملہ ذمّہ داریوں کو محسوس کیا اور ان کو پورا کرنے کی پُرخلوص

کوشش کی، لیکن ان کے پہلو بہ پہلو ایسے منطقے بھی موجود تھے جن میں اس کا قطعی فقدان تھا۔

۱۔ بعض حضرات نے بھیس بدل کر نقّالی کے فن کا ثبوت دینے کی کوشش فرمائی اور ہمیں حضورِ پیغمبر میں سخت نادم کیا۔ اسلام مردانہ وجاہت اور طنطنے کا خالق ہے۔ نقّالی اور رام لیلا ہمارے یہاں پسندیدہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ رسم بد کئی سال سے عید میلاد کو داغ دار کر رہی ہے۔ اسے فوراً بند ہونا چاہیے اور علماء کو بالخصوص اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

۲۔ جوشِ مسرت میں آپے سے باہر ہو جانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں اور ایسی مسرّت یقیناً اس دن کے شایانِ شان نہیں جس مسرت سے تنظیم اور ضبط و جذب کے فقدان کا اظہار ہو۔ ہمارے نوجوانوں کو بالخصوص اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہ ان کا کام ہے، انھیں ثابت کرنا چاہیے کہ وہ ایک منظّم اور با اخلاق قوم کے نونہال ہیں اور آنے والی دُنیا آج سے زیادہ منظّم اور با اخلاق ہو گی۔

۳۔ اسلام میں ہر کام اسلام کے تابع ہوتا ہے اور جو کام اخلاق کی اساسی قدروں کے تابع ہو وہ عبادت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اچھا کھانا، اچھا کپڑا پہننا، شادی بیاہ کرنا، بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرنا، ایسے اعمال ہیں جو دوسرے مذاہب میں دُنیوی

فرائض سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہی فرائض اسلامی اخلاقی اقدار کے تابع کر دیے جائیں تو عبادت بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہم جوان ہوں، بوڑھے ہوں یا بچے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی کے ہر عمل میں اگر ہم ضابطۂ اخلاق کی پابندی کا اہتمام کرلیں تو دُنیوی فائدے کے علاوہ آخرت کا ثواب بھی ہمارا حق قرار دیا جاتا ہے۔ دُہرے منافع کا یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ ہمیں اس بات کو کبھی اور کہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے نوجوان، ہمارے بزرگ، ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں اس آسان سی بات کو قبول فرمالیں گی اور ثوابِ دارین کا حق دار بننے کی کوشش کریں گی۔

ایک توجّہ طلب سوال

عید میلاد النّبیؐ کی تقریبات کے مواقع پر سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات سے اظہارِ محبّت کے نام پر بعض ایسی باتیں بھی کی جاتی ہیں جو معیوب اور ملّت کے سب افراد کے لیے انتہائی توجّہ کی طالب ہیں، مثلاً :

- خواتین کو پریشان کرنے کی وحشیانہ حرکتیں کرنا۔
- بھنگڑا یا اس قسم کے دوسرے ناچ ناچنا اور مبتذل فلمی ریکارڈ بجانا۔
- جلوس میں علمائے کرام اور قائدینِ شہر کی موجودگی کے باوجود جلوس میں نظم وضبط اور ترتیب و تہذیب کا نہ ہونا۔
- جوشیلے نوجوانوں کی طرف سے گھُڑ دوڑ کی سی کیفیت پیدا کر کے بعض لوگوں کے لیے باعثِ تکلیف ہونا۔

- اتنا شور وغُل کہ امتحان کی تیاری کرنے والے طلباء اور مریض پریشان ہو جائیں۔
- بلا وجہ اور بلا ضرورت سڑکوں کی توڑ پھوڑ۔

سرورِ دو عالمؐ کا یومِ ولادت منانے کے یہ انداز کسی بھی طریقے سے جائز اور مستحسن نہیں سمجھے جا سکتے۔ اور محبت اور عشق کی کوئی وارفتگی اس غنڈہ گردی، بے ہودگی اور کج رفتگی کا جواز قرار نہیں پا سکتی۔ لیکن یہ بات کوئی ایسی ڈھکی چھپی نہیں جس کا علم ہمارے سوا کسی دوسرے کو نہ ہو۔ ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ کوئی متین، شریف اور سنجیدہ شہری اس حماقت اور غنڈہ گردی کی معقولیت کا قائل نہیں۔ جلوس کے منتظمین اس سے نالاں ہیں۔ شہر کی انتظامیہ اس سے پریشان ہے۔ شریف اور متین شہری اس کو ناجائز، ناروا، نادرست اور نامعقول سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عید میلاد سے قبل ہر قابلِ ذکر حلقے کی طرف سے اس مضمون کی اپیلیں کی گئیں کہ اس مقدّس اور محبوب دن کے منانے کے لیے وہ طریقے اختیار کیے جائیں جو اس دن کے شایانِ شان ہیں۔ علمائے کرام کی دستخطی اپیلیں شائع ہوئیں۔ قومی اخبارات نے عوام کو اس حقیقت کی طرف بار بار متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ انتظامیہ کی طرف سے ہر ممکن کوشش کی گئی کہ یہ ناقابلِ قبول باتیں نہ ہوں اور مسلمان ان حرکات کے مرتکب نہ ہوں جو اسلام کی فطرت کے منافی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں اور کوششوں کے باوجود وہی ہُوا جسے

نہیں ہونا چاہیے تھا اور جس کے متعلق سب چاہتے تھے کہ نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ اتنی عظیم اور بسیط رائے عامہ اور تلقین وتشہیر کی اس ملک گیر آواز کے باوجود یہ سب کچھ کیوں ہُوا۔ اور رائے عامہ کا یہ زور اور تلقین وتشہیر کی یہ آواز ان ناروا ناجائز۔ نامعقول اور غیر اسلامی حرکات کو روک دینے میں کیوں ناکام ہوئی۔

اس کی بے شمار وجوہ بیان کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً پوری سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہم صدیوں سے بزرگوں کے عرس اور میلے کچھ اس انداز میں منانے کے عادی ہیں اور غیر شعوری طور پر عید میلاد النبیؐ کو بھی ہم نے اسی قسم کے میلوں میں سے ایک میلہ سمجھ لیا ہے۔ یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ عید میلاد کا جلوس حال ہی کی پیداوار ہے اور بانیٔ جلوس کے بقول یہ ہندوؤں کی رام لیلا کے جواب میں ایجاد کیا گیا تھا۔ اس لیے جوش و خروش، شان وشوکت اور دبدبے وطنطنے کے لیے اس میں کچھ باتیں شامل ہوگئیں جو اسلام کے مزاج کے موافق نہ تھیں، لیکن جنھوں نے اب روایت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ وجہ بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے کہ جذبات کے اخراج کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ملنا چاہیے۔ اتنے بڑے ہجوم پر قابو پانا اور اسے نظم وضبط کا پابند بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ تفریح کے بھوکے اور ہاؤ ہُو کے ذریعے جذبات کے اخراج کے متلاشی لوگ اس موقع کو غنیمت سمجھتے اور اس قسم کی حرکتیں کر جاتے ہیں۔

لیکن ان نہایت درست وجوہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سب سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں کہ صبح و شام اسلام کے غلغلۂ بلند کے باوجود ہم اپنے آپ کو اسلام کے مزاج کے مطابق منظم نہیں کر سکے۔ ہم کلمہ طیب پڑھنے، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی عزّت و حُرمت پر قربان ہو جانے کے لیے ہر دم تیار رہنے اور پُورے فخر کے ساتھ سینہ تان کر اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود ان ذمّہ داریوں اور فرائض کو نہیں سمجھ سکے جو یہ دعوے اور یہ جذبات ہم پر عائد کرتے ہیں۔

اور پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تجزیہ درست اور یہ نقطہ حقیقی ہے تو اس کی ذمّہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت کو چند سوالات کی شکل میں سمجھا جا سکے گا۔

۱۔ دیندار طبقہ اگر صرف کفر کے فتوے جاری کرنے او فاسق و فاجر جیسی گالیاں دینے پر اکتفا کرے تو اسلام کی صحیح راہ سجھانے کے لیے آگے کون بڑھے گا؟

۲۔ اگر حکمران طبقہ زبان سے اسلام کا دم بھرتا رہے، لیکن قانون، آئین اور نظامِ مملکت کے دیگر شعبوں کے ذریعے اسلام پر عمل کرنے سے دامن بچاتا رہے تو عوام اپنے ذہن میں اسلام کا کیا نقشہ قائم کریں گے۔

۳۔ اگر تفریح کی انسانی اور فطری خواہش کی تکمیل کے لیے ہم وہی طریقے اختیار کریں جو ہم کرتے ہیں تو اس کے

ذریعے قائم ہونے والی عادت یا مزاج کو مقدس ایام پر
روکنے کی کون سی ترکیب کامیاب ہوگی؟
۴۔ اگر تعلیم کا نصاب، نظام اور طریقِ امتحان ایسا ہو جو ہمیں
محض 'دانشور' بنائے اور نظم و ضبط سے دور لے جائے
تو ہمارے ذہن کی تربیت کون کرے گا؟

یہ سوال ہم ان تمام شعبوں کے عمائدین کی خدمت میں بصد احترام پیش کرتے ہیں اور ان کے متوقع جواب کے پیشِ نظر پوچھتے ہیں کہ اس کے بعد وہ رائے عامہ، انتظامیہ کی وہ کوشش، اخبارات کا وہ انتباہ جو عید میلاد سے قبل کی چیزیں تھیں اس یوم سعید پر بھی کارآمد ہوسکتی تھیں؟

آؤ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھیں!

جس وقت یہ سطور قارئین کی نظروں سے گزریں گی میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تقریبات بے پناہ عقیدت کو جلو میں لیے جلوہ افروز ہوں گی، اکابر کے پیغامات، عوام کے جلوس، محبّانِ رسالت کے جلسے علمأ کے وعظ، جرائد کے خاص نمبر، پھولوں کے گجرے، شیرینیوں کے طشت، کھانوں کی بہاریں، غرض کہ مسرّت، محبّت اور عقیدت کا ایک سیلِ بے پناہ ۱۲ ربیع الاوّل کو اس طرح امڈ آئے گا کہ ربیع الاوّل کا بقیہ حصّہ بھی اس کے اثر سے شاداب رہے گا۔

مگر سرکارِ رسالت مآبؐ کے عقیدت مندو! آؤ ذرا اپنے کردار کی گہرائیوں اور ضمیر کی خلوتوں میں اُتر کر یہ دیکھیں کہ اس مظاہرۂ عقیدت کے بعد ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟

ہم میں سے کتنوں کا عشقِ رسُولؐ اتنی رُوح اور اخلاص رکھتا ہے کہ

وُہ اپنی زندگیوں کے موجودہ غلط نقشے پر احساسِ ندامت کے ساتھ نظرِ ثانی کریں، اور پھر اس کی ترمیم و تطہیر کی فکر کریں؟ کتنے ہوں گے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ کرنے کے بعد اس کلیّہ کو اپنے لیے راہنما اصول بنالیں گے کہ:

"جو کچھ تمھیں رسُول کی طرف سے ملے اسے
قبول کرو اور جس چیز سے تمھیں رسول روکے اس
سے رُک جاؤ۔"

(رسُول پاکؐ نے زندگی کا ایک خاص تصوّر ہمیں دیا ہے۔ حقائق کے متعلق ایک خاص شعور ہمیں عطا کیا ہے۔ کردار کا ایک نقشہ ہمارے لیے متعیّن فرمایا ہے۔ سیاست و تمدّن کا ایک ضابطہ ہمارے سامنے رکھا ہے۔ حکومت چلانے کا ایک طریق کار وضع فرمایا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانیت کا مطلوبہ نمونہ اپنی کامل اور معیاری شکل میں خود اپنی ذات کے اندر جلوہ گر کیا ہے اور اس نمونے پر لاکھوں صحابہؓ کی زندگیاں قرآنی سانچے میں ڈھال کر دکھائی ہیں۔ آخر ہم میں کتنے دیوانگانِ نبوّت ایسے ہوں گے جو اپنی زندگی کو اس مقدس سانچے میں ڈھالنے کا عزم باندھ لیں اور اپنے وجود میں ایک نئے انسانی کردار کی تربیت کا آغاز کردیں؟

حضورؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے انسان کو انسان کی خدائی اور قاہری سے نجات دلائی اور اس کی ایک ایک مشکل کا خاتمہ کردیا۔) دوسرے انسانوں کی جانوں، مالوں اور عزّتوں پر کسی بڑے سے بڑے انسان

کے ہاتھ میں کوئی کھلا اور بے قید اختیار باقی نہیں رہنے دیا۔ سیاسی، قانونی، سماجی اور اخلاقی مساوات عملاً قائم فرما دی۔ کچلے اور پسے ہوئے انسانوں صحرائی بدوؤں بلکہ لونڈیوں اور غلاموں تک کو اٹھا کر پرانے اکابر اور فرمانرواؤں اور سرداروں اور آقاؤں کے ہمدوش کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے مسلمان ہیں جو آج یادِ رسالت تازہ کرنے کے بعد اپنے ان قاہرانہ مرتبوں کو چھوڑنے کا تہیہ کر لیں جو انھیں کسی نہ کسی دائرے میں دوسروں کے بالمقابل حاصل ہیں۔ اور اسی طرح ہم میں سے سماجی جبر و ظلم اور سیاسی و معاشی استبداد کے مارے ہوئے کتنے افراد ہیں جو حضورؐ کے پیغام و کردار سے درسِ ہمت لے کر انسانیت کا مساویانہ مقام حاصل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔

حضورؐ نے رنگ و نسل، زبان اور محض جغرافیہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی باطل ثقافت کے ایک ایک نقش کو ایوانِ تمدّن سے محو فرما کر نئی نظریاتی ثقافت کی بُنیاد رکھی تھی۔ آج ہم میں سے ایسے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہو گی جو رسُولِ پاکؐ کے کارنامۂ حیات کی رُوئداد ذہنوں میں تازہ کرنے کے بعد ایک بار پھر جاہل ثقافت کے بُت کدہ کدۂ رنگین کے اصنام کو توڑنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور حضورؐ کی تعمیر کردہ ثقافت کا احیاء کرنے پر آمادہ ہوں؟ کتنوں سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ انھیں دورِ حاضر کی اخلاق باختہ تہذیب نے جن جن روگوں میں مبتلا کر رکھا ہے ان سے نجات پانے کے لیے وہ اپنی پُوری قوّت صَرف کر دیں گے؟

(حضورؐ نے اپنے پیروکاروں کو مساواتِ محمدیؐ کا عملی نمونہ دیا۔ آپؐ نے بتایا کہ ظلم اور غیر منصفانہ معاشی نظام کے خلاف جدّوجہد جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے حقوق العباد ادا نہ کرنے والوں کو اپنی شفاعت سے محروم ہونے کی وعید سُنائی ہے۔ بہت سی چیزوں کو رُوحانی ہلاکت کا موجب قرار دیا ہے بعض کو سببِ لعنت ٹھہرایا ہے اور بعض کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا کہ:

"فلاں جُرم کے مُجرم جب قیامت میں آکر مجھ سے شفاعت کے لیے کہیں گے تو ان کو میرا جواب یہ ہوگا کہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔"

دیکھنا یہ ہے کہ ان شاندار مظاہرہ ہائے عقیدت کے بعد ان برائیوں کو ترک کرنے کے لیے ہم لوگ کہاں تک تیار ہوتے ہیں؟

یہ چند ٹھوس اور صاف سوالات ہیں جو ہم میں سے ہر ایک کے ضمیر سے جواب مانگتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں اگر ہم اجتماعی پیمانے پر معاشرہ میں تبدیلی کی کوئی لہر پیدا کرسکیں تو پھر یقیناً ہم نے یادِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم مناکر ایک کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اگر ان سوالوں کے جواب میں کوئی تعمیری جذبہ ہمارے اجتماعی ماحول میں نہیں اُبھرتا تو کہنا چاہیے کہ:

"گریہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں")

ذکرِ رسول ؐ

66

کوثر نیازی

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز
لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی